# نظم آزاد

جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

از

شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

حسب فرمائش

آغا محمد طاہر نبیرہ حضرت آزاد

در مطبع کریمی لاہور طبع شد

سنہ ۱۹۲۶ء

بار سوئم

قیمت ۸ر

# نظم آزاد

جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

از

شمس العلما مولینا مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم

سابق پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

حسب فرمایش



آغا محمد طاہر نبیرہ حضرت آزاد

در مطبع کریمی لاہور طبع شد

سنہ ۱۹۲۶ء

قیمت ۱۰؍

بار سوئم

(۷۸۹۱)

یہ راز سب پر ظاہر ہے کہ ہماری زبان جس کو اُردو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کے ملاپ کا پھل ہے۔ یہ نئی ایجاد ضرورت کے گھر میں پیدا ہوئی۔ روز مرہ کاروبار کی ماں نے پیٹ میں رکھا۔ لشکر کے بازاروں میں بچپن گذرا۔ لڑکپن تھا کہ کھیل کود نے شاہجہان بادشاہ کے قلعہ میں پہنچا دیا +

یہ ہونہار بچہ ایسی باتیں بناتا تھا کہ دیسی پردیسی سب کے دلوں کو بھاتا تھا۔ اور اپنے ننھے ننھے جملوں سے ہر امیر غریب کا مطلب ادا کرتا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو بازارِ حُسن میں ترچھی نگاہیں لڑانے لگا۔ شعرا کہ ازل سے تیرِ عشق کے زخم خوردہ ہے۔ ان کو یہ ادا بہت پسند آئی۔ جھٹ گود میں اُٹھالیا اور اپنے دل کی باتیں گل و بلبل کے افسانے اسی کے منہ سے کہلوانے لگے +

شہنشاہ ہند محمد شاہ جنکی عشق بازی و ہوسناکی قیامت تک عبرت کا مرقع رہیگی ان کو اس کی نازک ادائی ہزار جان سے پسند آئی اور اس کو اپنی مصاحبت خاص کا درجہ عنایت فرمایا +

یہ لڑکا اسی گلریز و عنبر بیز صحبتوں میں جوان اور جوان سے نوجوان ہوا۔ مگر وہاں کی آب و ہوا کچھ موافق نہ پڑی۔ بلکہ ہر وقت کی رنگ رلیوں نے مزاج میں کچھ ایسی

وارفتگی پیدا کردی تھی کہ ہر وقت گل و بلبل۔ جام و مے۔ حسن و عشق۔ ہجر و وصال کے گیت گانے لگا۔ اور اگر کوئی شخص اُسے ان دلبستگیوں سے علیحدہ کرتا تو حسرت و یاس، غم و الم، سوز و غم کی ایسی دردناک تانیں لگاتا کہ سُننے والوں کے رہے سہے حوصلے پست ہو جاتے اور دل ڈھے جاتے۔ مجبوراً پھر اس کو گلزاروں میں لیجا کر چھوڑ دیتے +

خدا کی قدرت دیکھئے کہ دانایان فرنگ جو سوداگری کے لباس میں سلطنت کا بازار لگانے آئے تھے اُن کو ایک ترجمان کی ضرورت پڑی۔ اُنھوں نے ہر چند نگاہ دوربین کو انتخاب کے میدانوں میں دوڑایا مگر ان کو سوائے اس آشفتہ مزاج نوجوان کے اور کوئی اس کا اہل نظر نہ آیا +

بصد مشکل اُنھوں نے اس لڑکے کو منایا۔ کچھ لالچ دیا۔ کچھ وعدے کئے۔ اور اس عاشق مزاج کو قابو میں لائے۔ اوّل اس کو کلکتہ میں رکھا۔ سوداگری کے بازار میں لین دین پر لگایا۔ پھر دفتروں میں لئے لئے پھرے۔ مگر اس کی حالت یہ تھی کہ جب کہیں چار ہم مشرب نظر آ جاتے اور موقعہ پاتے۔ جھٹ اپنا پرانا رنگ جا بیٹھتے اور وہی آشفتہ مزاجیاں اور وارفتگیاں سب کی آنکھوں میں پھر جاتیں +

اب اس نوجوان نے یہ طریقہ اختیار کر لیا کہ گذر اوقات کے لئے تو انگریزوں کے دفتروں میں دن گذارتا۔ اور لطف و کیف کے لئے دہلی کے بازاروں امیروں کے دیوان خانوں اور مغلوں کے درباروں میں راتیں صرف کرتا۔ ابھی یہ قصّہ یہیں تک آیا تھا کہ زمانے نے ایک ورق اور اُلٹا۔ مغلوں نے سلطنت کا کوہ نور بیٹر

اپنی بے اعتدالیوں کے باعث انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا +

پھر کیا تھا بدامنی کی آندھیاں آئیں۔ آشوب کے مینہ برسے۔ خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ہزاروں سینہ بنا سے لاکھ کے گھر خاک ہو گئے اور وہ عشرتکدے درسِ عبرت دینے لگے۔ اور ہندوستان میں کسی کو سر چھپانے کا ہوش نہ رہا۔ مگر اس نوجوان کو انگریزوں نے دفتروں میں اور شرفا نے گھروں میں پناہ دی۔ جب امن و امان کا حکم عام ہوا تو پھر اُردو کا شہ زور جوان دلبستگیاں ڈھونڈنے لگا۔ مگر اب سوائے حسرت و یاس کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ یہ اسی کے مرثیے پڑھنے لگا۔ اور ایسے انداز سے درد انگیز قصّے سناتا کہ بھلے چنگے دل بیٹھ جاتے اور کام پر دل نہ لگتا تھا۔ غرضکہ اُلٹا وبال جان ہو گیا +

یہ زمانہ ہندوستانیوں کے لئے عجب زمانہ تھا۔ اب یہ حاکم نہ تھے۔ بلکہ محکوم۔ اور محکوم بھی ایسی قوم کے جو ظاہر میں ہم جیسے آدمی مگر حقیقت میں کام کرنے کی مشین تھے۔ جنہوں نے علم و فلسفہ۔ سائنس و حکمت کو اپنا دوست نہیں بلکہ غلام بنا لیا تھا۔ ایسی حالت میں وہی افراد ان کا ساتھ دے سکتے تھے جو اُن جیسی ہمت اور ولولے رکھتے ہوں ورنہ دو قدم بھی نہ چل سکتے تھے۔ مگر یہ ولولے فرداً فرداً پیدا ہونے ناممکن تھے۔ یہ قومی جوش و خروش کے محتاج ہیں۔ اور جبتک قوم کو نہ جگایا جائے۔ یہ نعمت محال ہے +

اب دشواری اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ہندوستان کو کون جگائے اور جگائے تو کس زبان میں قومی ترانہ بلند کرے۔ کہ خدا نے اسی اُجڑے دیار جس کو دلّی کہتے ہیں وہاں کے ایک خانماں برباد

مردِ خدا کو پنجاب میں ہماری زبان کا مجدد بنا کر بھیج دیا۔

اس نے وہ عشرتکدے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ زبان مذکور کی عہد بعہد کی ترقیاں اس کے سامنے پرورش پا چکی تھیں۔ اس انقلاب سے پہلے بھی وہ اور اُس کا خاندان اُردو کی خدمت کو ملک کیلئے واجب جانتا تھا۔ اس کے والدین نے اس کا نام محمد حسین رکھا تھا اور اُردو کے پیغمبر حضرت ذوقؔ نے آزاد کا معزز تخلص عنایت فرما کر اسکو زبان مذکور کا مجدد بنایا تھا۔

حضرت آزاد نے پہلے تو اُردو نثر کی داغ بیل ڈالی اور اس میں ایسی راہ نکالی کہ سبحان اللہ پھر اس پر ایسی عبارت آرائی کی کہ اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ مگر قوم کو جگانے اور اُٹھانے کے لئے نثر کا کھیل کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ وہاں نظم کے جادو کی ضرورت تھی۔ تو اس جادو کار نے اسی اُردو کے شہ زور جوان کو للکارا۔ وہ اس دولت سے خالی تھا۔ اُس کے خزانے پر حسن و عشق کا خزانچی قبضہ کئے بیٹھا تھا۔ مگر مولانا نے ہمت کے پر لگائے۔ یورپ کی زندہ قوموں کے افسانے مانگے تاریخ کے پھول اسمیں سجائے۔ حسن و عشق کے خزانچی سے الفاظ لئے اور نظم اُردو میں اسی جگمگاتے مینار کی بنیاد رکھی۔

۱۸۷۴ء تھا کہ نظم اُردو میں انقلاب آیا۔ لاہور میں ایک مشاعرہ کی بنیاد ڈالی اور اس میں یہ گلدستہ قوم کے سامنے پیش کیا۔ کچھ ہم خیال احباب نے اس کو سنبھالا۔ کچھ حکام وقت نے اس کی نگہداشت کی اور یہ بڑھنے لگا۔ ابھی پودا ابھی نہ بننے پایا تھا کہ پرانے دقیانوسی حسن و عشق سے از کار رفتہ گل و بلبل کے مرثیے ہاتھوں میں سنبھال اس کی مخالفت کے لئے نکل کھڑے ہوئے اس خیال کے سادہ لوح بزرگ جہاں جہاں تھے۔ تڑپ گئے اور متفق ہو کر اس نوخیز پودے

کے اکھاڑنے کے درپے ہو گئے۔

اب کیا تھا ہر طرف سے ملامت کے تیر آنے لگے کہ ہائے ہائے یہ شخص پرانی شاعری کو خاک میں ملائے دیتا ہے، اور ہمارے بزرگوں نے جو جو سلطنتیں اور حکومتیں کھو کر حاصل کی تھی اسکو یوں برباد کرتا ہے۔ افسوس ان حضرات کی آنکھوں پر قدامت کی پٹی بندھی ہوئی تھی اور لکیر کے فقیر ہو کر گھر بیٹھے کمبل میں مست ہو رہے تھے۔ کاش وہ ذرا غور سے اس گلکاری کو دیکھتے تو انہیں اسمیں میر کا درد سودا کا زور کلام۔ آتش کی آتش بیانی۔ ذوق کی سادگی اور محاورہ بندی میر حسن کی روانی سب کچھ نظر آجاتا۔ مگر ہاں اتنا فرق ضرور تھا کہ ان بزرگوں نے فقط زبان مذکور کی پرورش کی اور اپنی دل لگی اور دلبستگی کا سامان فراہم کیا۔ اور حضرت آزاد نے اسی سرمایہ سے نظم اردو کا نیا مینا بنالیا اسمیں قومی جوش و خروش اور ہمت کے ولولوں کا چراغ روشن کیا کہ اسکی روشنی اور چاندنی میں بستی کے رہنے والوں کو اور قوموں کی کوششیں اور ہمتیں صاف آئینہ ہو جائیں اور انہیں بھی اپنے لئے اخلاق حسنہ اور قوم کیلئے بہبودی کا سرمایہ جمع کرنیکی امنگ پیدا ہو۔

اس دن کون کہہ سکتا تھا کہ وہ پودا ایکدن اسقدر گھندار درخت بن جائیگا اور وہی تیر ملامت اسکی شاخیں اور پھل پتے بنکر قومی ترانے گائینگے۔ اور انہیں ملامت کرنے والوں کی اولاد کو اسکی روشنی سے فیض پہنچیگا۔ آج ڈاکٹر اقبال ظفر علی خاں وغیرہ اور ہزاروں قومی درد رکھنے والے شاعر پیدا ہو جائینگے۔

یہ نظم اردو میں اسقدر عظیم الشان کارنامہ ہے جو قیامت تک سونے کے حرفوں سے لکھا جائیگا۔ اور یاد رہیگا۔ اور جبتک نظم آزاد باقی ہے۔ یہ قوم کے بچوں کے دلوں کو گرمائیگی۔ اس کی ہر نظم ایک کتاب ہے۔ ایک سبق ہے۔ ایک رستہ ہے بلکہ ایک دیا ہے جو سب چلنے والوں کو راستہ دکھا رہا ہے۔ بعض جگہ بحر کی مجبوری اور زبان کی کم مائگی کیوجہ سے آج ہمکو کچھ الفاظ بوجھل بھی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دوستو خیال تو کرو کہ ہمارے مصور کا یہ نقش نقش اول تھا۔ با اینہمہ کامیاب تھا۔ اس پر غور نہ کرو۔ بلکہ اس درخت سے پھل کھاؤ اور اسکی گٹھلیوں سے اور پودے لگاؤ۔ آج دنیا بھر کے

وسائل تمہاری خدمت کو ہاتھ باندھے حاضر ہیں۔ اُنسے مدد لو۔ پیوند کرو۔ اور دیکھو کیا سے کیا ہوتا ہے +

یہ نظمیں یا مثنویاں ۱۸۹۷ء میں والد مرحوم نے دردمند احباب کی فرمایش سے جمع کیں اور چھپوائیں اس وقت قوم کو اس طرف بہت کم خیال تھا۔ ایک عرصہ دراز میں وہ ختم ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں مولانا کے انتقال کے بعد ملکی ضرورتوں نے اہل ملک کو قومی اصلاح کی طرف زیادہ متوجہ کردیا تھا۔ والد مرحوم نے دوبارہ چھپوائی۔ اور اسمیں غزلیات، قصائد، متفرق اشعار جو مل سکے شامل کردیئے یہ کثیر التعداد ایڈیشن بہت مرغوب اور مطلوب ہوا۔ اب تیسرے ایڈیشن کے چھپوانیکا فخر قدرت نے میرے نام پر لکھدیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اس عزت سے سرافراز ہوتا ہوں۔ میں نے نظم آزاد علیحدہ کردی ہے کیونکہ "حسن و عشق کی قبا سے آزاد" کا خوبصورت جامہ اس کے زیب سر ورق ہے۔ دوسرے اہتمام ہندستان میں یہ کتاب نوجوان طالب علموں کے ہاتھوں میں اور ہاتھوں سے کانوں اور آنکھوں کے راستے دلوں میں اُترتی ہے۔ لہذا میں نے غزلیات وغیرہ علیحدہ دوسرے حصہ کے لئے رکھ لی ہیں۔ انشاء اللہ زندہ رہا تو اور غیر مطبوعہ غزلیات، قصائد، مرثیے، سلام، رباعیات شامل کرکے اسکو چھپواد ونگا۔ اس دفعہ اسکا سائز بھی بدلدیا ہے۔ اس میں بھی طالب علموں کی سہولت مدنظر ہے +

اب خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ مجھ ناچیز عبد ذلیل کے اہتمام اور سعی سے چھپی ہوئی نظم آزاد کو قبولیت کا خلعت عنایت فرما اور جو مقصد کہ مولانا ممدوح کا تھا اُسے پورا کر۔ کہ ہمارے ملک کے نوجوانوں کو اپنے پیارے ملک کا جاں نثار اور سچا وفادار بنا اور شرافت حقیقی کے وہ جوہر عطا فرما جو ہمارے بزرگوں کے لئے تمغۂ امتیاز تھے اور ہم کو مخلص اور ایثار مجسم بنا دے۔ آمین یا رب العالمین +

دعا کا محتاج طاہر نبیرہ آزاد

۵ مارچ ۱۹۲۶ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات

فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ دنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں اول نبض انسانی کہ بے گویائی حال باطن بیان کرتی ہے۔ دوم شعر کہ انہیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیت اور اس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلام موزوں و مقفّیٰ لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت چاہئے کہ وہ کلام مؤثر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اُس کا سُننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو۔ لیکن اثر سے خالی ہو۔ تو وہ ایک ایسا کھانا ہے کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ نہ کھٹّا نہ میٹھا۔ جیسا کہ شعر کسی اُستاد کا ہے

دندانِ تو جملہ در دہانند     چشمانِ تو زیرِ ابروانند

جب انسان کے دل میں قوّت گویائی اور جوشش مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خودبخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور اُس قوّت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا۔ اسی قدر کلام پُرتاثیر ہوگا۔ روئے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا۔ کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدم کے دل پر طاری ہوا اُسے نتیجہ جوش غم کا سمجھنا چاہیے۔ کہ باوجودیکہ اُس وقت تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا۔ مگر جوش طبیعت سے جو کچھ کلام اُس وقت ان کی زبان سے نکلا موزوں تھا۔

چنانچہ وہ سُریانی میں اب تک موجود ہے۔ جبکہ اصل کلام موزوں کی حضرت آدم
سے ہوئی۔ تو فرزند رشید وہی موزوں طبع ہے۔ کہ جو باپ کی میراث سے بہرہ ور
ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس قوت انسانی
بھی اُسی میں کامل سمجھنی چاہیئے جس میں قوتِ گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت
نثر کے زیادہ تر زورِ طبیعت سے نکلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے
مؤثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون کوئی مطلب کوئی خیال جو انسان کے دل
میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہے تو متکلم سے نقش مُدعا کو رنگ تقریر میں لاتا ہے
تاکہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصوّر ہے۔ لیکن نہ وہ مصوّر کہ خر و اشتر۔ درخت و
پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا مصوّر ہے کہ معنی کی تصویر صفحۂ دل پہ کھینچتا
ہے اور ایسا اوقات اپنی رنگینیٔ فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائی
دیتا ہے۔ وہ اشیاء جن کی تصویر قلم مصوّر سے نہ کھنچے۔ یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے
چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے۔ مگر صدہا سال سے آج تک اُن کی
تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کبھی تصویر غم صفحۂ دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی مضامین فرحت
و عیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہائے مرتبہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا
دیتا ہے جب چاہتا ہے رُلا دیتا ہے۔ اہل عرب معرکہ ہائے قتل میں رجز خوانی
کرتے تھے۔ سلاطین ہند کے ہاں صفِ جنگ میں سورما۔ ویر۔ راوت
بھاٹ وہ وہ کڑکے کوت کہتے تھے کہ لوگ اپنی جانیں موت کے مُنہ
میں جھونک دیتے تھے۔ اور اب تک یہ عالم ہے کہ جب سُنے جاتے ہیں
بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سکندر اعظم کتاب ہومر کو دیکھتا تھا اور سوتے
میں بھی جُدا نہ کرتا تھا شاعر اگر چاہے تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔
پتھر کو گویا کر دے۔ درختانِ بادِ رنگل کو رواں کر دکھائے۔ ماضی کو حال۔ حال کو

استقبال کر دے۔ دُور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان۔ خاک کو طلا اندھیر
کو اُجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو۔ تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہیئے کہ جسے
چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں
میں ہے۔ ترازو اُس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے جُھکا دے +

نظم درحقیقت ایک شاخ گُل ریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں کے
رنگ و بو سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے شعر سے رُوح تر و تازہ ہوتی ہے۔
پھولوں کی بُو سے مختلف خوشبوئیاں محسوس دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے۔
کسی کی بُو مست ہے۔ کسی کی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سُہانا
پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھول کہ کبھی چمن میں۔ کبھی
ہار میں۔ کبھی عطر کھنچ کر۔ کبھی عرق میں جا کر کبھی دُور سے کبھی پاس سے مختلف
کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف
عبارتوں میں رنگا رنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں +

عالمِ جسمانی میں انسان کے لئے غذا مادہ حیات ہے۔ اسی طرح عالمِ معنی
میں رُوح کے لئے غذا درکار ہے چونکہ اشعار و مضامین لطیف سے رُوح
قوت کمال اور طاقت بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اُس کی غذا ہے۔ رُوح
کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے۔ کہ وہ خاص روح القدس کے آفتاب
قدرت کا پرتو ہے۔ اسی سے شعر کے جوہر لطافت کو خیال کرنا چاہیئے۔ کہ
نفاست میں کس مرتبۂ عالی پہ ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبت خاص عالمِ بالا سے ہے
کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے اُدھر سے اپنا سلسلہ جاری
کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتوہ روح القدس کا اور فیضان رحمت الٰہی
کا ہے۔ کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ظاہرا

اپنے کلبۂ احزان میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح پر حکومت کرتا ہے
جیسے کوئی صاحبِ خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں
سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔
جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے۔ اور یہ تصرف مالکانہ
اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اُس کی جسے ایسے ملکِ معنی کی
سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزار فصاحت کا پھول ہے۔ گلہائے الفاظ کی
خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتوہ ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے رُوحانی کا
جوہر۔ تاثیر معنوی کا ست ہے۔ رُوح کیلئے آبِ حیات ہے۔ گردِ غم کو دل سے
دھوتا ہے۔ طبیعت کو پھیلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور
بے نیازی۔ ذہن کو قوتِ پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا
ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت
سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردد میں غرق
رہتا ہے لیکن ایک شعر کہہ کر جیسی اُس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے
بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں
ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے۔ کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت
حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لطف طاقت تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔
اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے۔ صاحب درد ہی اُسے خوب جانتا
ہے۔ کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ
فضیلت اختیاری نہیں۔ یعنی موزونیٔ طبع جوہرِ خداداد ہے۔ اور اس نعمت کو
خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ رُباعی

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند     سوزِ دل پروانہ مگس را ندہند

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجّہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اُس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے ✣

اکثر لوگ ایسے ہیں۔ کہ جسمانی محنت سے مر کھپ کر انہوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطف شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں ایک مصرع پُر درد اُن کی زبان سے نہ نکلے اُن کا ذکر بھی انشاءاللہ اس سلسلے میں آئے گا ✣

بعضے ایسے ہیں۔ کہ اُن سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انہیں موزوں و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضب الٰہی ہے۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں۔ مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں۔ کہ زبان اُن کی صاف ہے۔ مگر مضامین عالی نہیں چنانچہ ہر ایک کی جگہ پہ بجا سے خود اشارہ کیا جائیگا۔ یہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ کہ جوش مضامین اور شگفتگی طبع کے لئے بعض بعض موسم خاص ہیں چنانچہ فصل بہار اور موسم برسات میں طبائع موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ناموزوں اور مُردہ دلوں کی طبیعتوں میں بھی ایک حرکت مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعری کے لئے

اوقات اور مقامات خاص ہیں۔اول خلوت۔ کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے۔ خواہ گھر میں گوشۂ عافیت ہو۔ خواہ باغ خواہ صحرا خواہ کنار دریا۔ اور دل ہمہ تن اُسی میں مصروف ہو +

اکثر وقت شب جب خلقِ خدا اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے۔ تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سن سان ہو جاتا ہے۔ تب اُس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے۔ اور مضمون پیر تا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف اور ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذت حاصل ہوتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظ پُر معانی زبان سے تراوش ہوتے ہیں +

شاعر کو چاہیے۔ کہ طبیعت اُس کی زیادہ تر قابل اور متاثر ہو۔ مثل آب رواں کہ جو رنگ اُس میں پڑ جاتا ہے وہی اُس کا رنگ ہو جاتا ہے اور جس چیز پر پڑے ویسا ہی رنگ دیتا ہے مائل کی رباعی اِس مقام پر مجھے یاد آئی ع
کعبہ میں بھی ہم نے اُسے جاتے دیکھا اور دیر میں ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے یہ یکتا و دوئی میں مائل ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

اُس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت۔ یا غم۔ رزم یا بزم کا باندھتا ہے جتنی اُس کی طبیعت اُس سے متاثر ہوتی ہے اُتنا ہی اثر سُننے والے کے دل پر ہوتا ہے۔ دنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں۔ کہ جب وہ شعر سُنتے ہیں تو دل بے قرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اُن کے دل مثل آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ

کہ اُن کے سامنے اگر طلسمات معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو تو بھی اُنہیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورتِ دل ہے کہ نورِ معنی اُس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشندلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروبِ آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ نوبہارِ قدرتِ الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلانِ بے جبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکّر میں چلا جاتا ہے۔

علمِ موسیقی کا لطف اور گلزار بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بیچارے اُن کے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائی دل سے محروم ہیں وہ کیفیت شعر و فصاحت کلام سے محروم ہیں۔ اِس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعض طبائع شعر سے متنفّر پائی جاتی ہیں۔ اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں۔ تو بے شک شعر بالکل کار بے فائدہ ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبع موزوں رکھتے ہیں اگر زورِ طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ وکسب دُنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے لیکن جو لوگ سِرّ معنی اور اصل سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صنّاع خبث طبیعت سے صنعت کو بری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا۔ شیطان نے معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار

کی۔ پس اس کے لئے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔ مسائل فلسفہ و حکمت جن سے اہل ہدایت ثبوت ذاتِ باری اور تصدیق وحدت الٰہی کرتے ہیں اُسی سے اہلِ ضلالت دہر و الحاد پہ استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے اُن کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آسکتا۔ اُسی طرح شاعروں کی بدزبانی و بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر کہنا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش خیالاتِ سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے۔ اور اسے قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلۂ خاص ہے۔ خیالاتِ پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں +

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور اُن تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے البتہ فصاحت اور بلاغت اب زیادہ ہے۔ مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکام عصر کی قباحت ہے انہوں نے جن جن چیزوں کی قدردانی کی لوگ اُس میں ترقی کرتے گئے ورنہ اسی نظم شعر میں شعرائے اہل کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں جن کی بنا فقط پند و اندرز پر ہے اور ان سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے چنانچہ بعض کلام سعدی و مولوی روم و حکیم سنائیؒ و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ امید ہے کہ جہاں اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی۔ فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے گو آج نہیں۔ مگر امید قوی ہے کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہو۔ آزادؔ

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا ۔۔۔ نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھے گا

تقریر جلسۂ منعقدہ ۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء

بندۂ آزاد محمد حسین

# مضمونِ لکچر

اے حاضرین باتمکین ! آج میں ایک ایسے امر پر گفتگو کرنے کو حاضر ہوا ہوں جس میں دخل دینا میری حد سے باہر ہے - کیونکہ وہ حقیقت میں اُس ملک وسیع کی زبان سے متعلق ہے جسے اہل عالم مملکت ہندوستان کہتے ہیں - اُس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حبّ الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی - امر مذکور کیا ہے ؟ نظم اور انشا پردازی اردو زبان کی ہے - جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب اور عام تصنیفات اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے - اس وقت یہ موقع نہیں کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کر کے پرانی بنیادیں نکالی جائیں - اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے جس میں فارسی کے مسافر نے آ کر عمل دخل کیا - اور صاحب خانہ نے اُس بن بلائے مہمان کو اپنے وسعتِ اخلاق سے اس کے خاطر خواہ جگہ دے دی ٭

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے عہد میں عام زبان تھی مگر درباروں اور علموں پر یہاں کا قبضہ تھا - یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بلاغت کے دریا لوٹتے تھے - اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گھروں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی - چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی - اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اس اعلےٰ درجہ پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں ہیں - پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب پورا پورا ادا کرتی تھی جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں [۱] ٭

[۱] اس عبارت کے بعد ایک پیراگراف چھوٹ گیا ہے جو صفحہ ۲ پر درج ہے ٭

اردو کے مالک اُن لوگوں کی اولاد تھے جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے۔ اسی واسطے اُنہوں نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دل چسپ اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پردازی کا فوٹو گراف فارسی سے اردو میں اُتار لیا تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے۔ اُنہیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چنبا چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔ ہزار و بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں۔ اُن کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم اور اسفندیار کی بہادری۔ کوہ الوند اور بے ستون کی کی بلندی۔ جیحون سیحون کی روانی نے یہ طوفان اُٹھایا۔ کہ ارجن کی بہادری۔ ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف بھری چوٹیاں اور گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا ✤

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہیئے۔ کہ اُس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہو گیا۔ اُس کے استعاروں اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں۔ جہاں کے چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لیئے انہیں پھولوں کا عطر اِس زبان میں آیا۔ بے شک اُنکی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجے پر ہے۔ اُس کی حد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو۔ تو باریکی اور تاریکئ الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے۔ کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب ✤

اے گلشن فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے کہ مبالغے
اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اُڑے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر
کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکتِ الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور
استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ
خوشی یا غم کسی شے پر رغبت یا اُس سے نفرت۔ کسی شے سے خوف یا
خطر۔ یا کسی پر قہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو۔ اُس کے
بیان سے وہی اثر وہی جذبہ۔ وہی جوش سننے والوں کے دلوں پر چھا جائے جو
اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بے شک مبالغے کا زور۔ تشبیہ اور
استعارے کا نمک زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔
لیکن نمک اُتنا ہی چاہیئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ تشبیہ اور
استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں جیسے کسی
معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اُس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے
نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقع
پر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟ ہمیں چاہیئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ
اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہار اصلیت
کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ
زمانہ کا کچھ اور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولیں گے تو دیکھیں گے۔ کہ فصاحت و بلاغت
کا عجائب خانہ کھلا ہے جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے
گلدستے ہار طُرّے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ
الگ کھڑی منہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب
ہمت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے ۔

اے میرے اہل وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامان آرائش سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں اُس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پُرانے ہو گئے۔ اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے لندن کے خلعت و زیور جو آج کے مُناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں۔ اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دُوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو۔ تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے۔ اور تمہیں درد نہیں آتا۔ اپنے خزانہ اور نئے توشہ خانہ سے ایسا بندوبست نہیں کرتے کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر سکے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ یہ وطن کا قرض ہے کہ قرض سے زیادہ اُس کا ادا کرنا واجب ہے +

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا۔ اور اُس سے نظم اور انشائے اردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ اُن لوگوں کی بدولت ہوئی۔ کہ بھاشا اور فارسی دونوں سے واقف تھے۔ تم خیال کرو جو اُس وقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا۔ آج بعینہٖ اردو و انگریزی کا حال ہے۔ پس اُس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتو حاصل ہو گا۔ تو اُنہی لوگوں کی بدولت ہو گا جو دونوں زبانوں سے واقف ہوں گے۔ اور سمجھینگے۔ کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں۔ جو اردو کے لئے زیور زیبائش ہو سکتے ہیں +

اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش و خروش۔ اور لطائف و صنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اِس قدر دے گئے ہیں۔ کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں جس میں کچھ وصل کا لطف۔ بہت سے حسرت و ارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزان۔ فلک کی شکایت اور اقبالمندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھا سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں +

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے۔ بے جگہ لٹاتے ہیں کیسی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا؟ سُن کر ترسیں۔ اپنے تئیں دیکھ کر شرمائیں۔ کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں۔ اُتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے جس کے اعلےٰ درجے کے نمونے

انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ردیف وقافیہ کے ساتھ ایسی دل پسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں۔

اے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہیگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بسبب بے قدری کے اور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پُرانی مورتیں باقی ہیں۔ وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی۔ اور اردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا۔

میرے اہل وطن! آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو۔ اُٹھو۔ وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ۔ تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقید ہو رہی ہے۔ اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو۔ نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی کہ اُن کی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی۔ اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ سر دست یہ کام کچھ مشکل ہے۔ کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کرکے پیدا کیا ہے۔ دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کرکے بہائے ہیں جب یہ دل پسند خیالات۔ شستہ الفاظ۔ پاکیزہ ترکیبیں۔ خوش نما تراشیں۔ مضمون کی گرمیاں۔ انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں کہ سننے والوں کے کانوں میں رس ٹپکاتی ہیں۔ اگر کوئی موزوں طبع چاہے کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اُن میں سے

جس کو چاہے لے لے اور اُن پر شاعری خرچ کرکے وہی لطف کلام میں پیدا کر لے۔ تو آج نہایت مشکل بات ہے۔ تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریے اُن ہزاروں پر پھول برساتے ہیں۔ جن کے سونے والوں نے انہیں چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں۔ جو ویسے لوگ پیدا ہوں۔ ویسی کوششیں کریں۔ اور ویسے ہی لطیف اور خوش آیندہ انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں +

تو بھی ہمیں مایوس ہونا نہ چاہیئے۔ اگر کوشش کرینگے۔ تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھینگے کیونکہ دلّی دن بھر میں گلزار نہیں ہو گئی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک اُن احاطوں کو آباد کر رہے ہیں وہ خود اس قیامت کے مضمون ہیں۔ جن میں شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذّت کم ہو تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی میں ربچک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں۔ البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک قدرتی قوتِ زبان و بیان اور اصلی فصاحت اعلےٰ درجہ کی چاہیئے۔ تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرمائے جس سے سُننے والوں کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدّت سے مجھے اور اکثر اہلِ وطن کو اس کا خیال ہے مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں۔ آج کل ہماری گورنمنٹ اور اُن اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمّہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کریگی +

میرے اہلِ وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکب ہے۔ ایک

ہندو۔ ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں کہ آج ہم
جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا
ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی
قوتِ نظم خود حدِ بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اس نے
تاریخ سے لیکر جغرافیہ۔ طب۔ منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا۔ نظم کی جنتری میں کھینچ
دوسرا جزو مسلمان۔ جن کی اصل عرب۔ عربی وہ زبان ہے۔ کہ جس میں مرد تو بالائے
طاق۔ گھروں کی عورتیں بلکہ لونڈیاں جب اپنی جوش تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا
کلام ایک پُرزور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں۔ کہ ایسے بزرگوں کی
اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری
زبان حرف تاثیر سے خالی ہو۔ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اوروں کے سامنے
ہماری زبان ضعف بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے
خاکِ ہندوستان اگر تجھ میں امرالقیس اور لبید نہیں۔ تو کوئی کالیداس ہی نکال۔
اے ہندوستان کے صحرا و دشت! فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک
ہی پیدا کر دو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ شاعری کے لئے اول قدرتی جوہر
بعد اُس کے چند تحصیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اُس کے شوق کامل
اور مشق دوامی میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں۔ اور نظم میں
خاک افتادہ۔ مگر سادہ لوحی دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط
اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے
میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں۔
جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ اور ایک مثنوی جو رات کی حالت
پر لکھی ہے۔ اس وقت گزارش کرتا ہوں ؎

# مثنوی موسومہ بہ شبِ قدر

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو — عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے — پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے — اور ڈالی آسپہ شام نے غربت کی گرد ہے
ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے — اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامانِ کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو نپٹا کے سو رہو

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں — اور روشنی تھی عام زمین آسمان میں
جو کچھ کہ تھے سفید و سیہ آشکار تھے — جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے
دولابِ چرخ پر مگر اپنا مدار ہے — چلتا اسی پہ دورِ خزان و بہار ہے
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے — اور رات کو بنایا ہے آرام کے لئے

رخصت ہو تو کہ آتی شبِ مشک ریز ہے
پھر صبح اٹھ کے چلنا گریز اگر یز ہے

آ اے شبِ سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو — عالم میں شاہزادیٔ مشکیں نسب ہے تو
آمد کی تیری شان تو زیبِ رقم کروں — پر اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
ہونا وہ بعدِ شام شفق میں عیاں ترا — اڑتا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا
چھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں — لہرانا پرنیان و حریرِ سیاہ میں
چمکے گا لشکر اب جو ترا آسمان پہ — فرماں نشان میں یہ اڑے گا جہان پہ

تا صبح ہو وے کارگہِ روزگار بند

آرام حکم عام ہو اور کاروبار بند

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے — ہر گوہر اس میں ملکِ حبش کا خراج ہے
لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں — ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

اس رنگ پر دکھا رہی کیا آب و تاب ہے
تیرا چمکتا چہرہ سیاہ آفتاب ہے

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی — ہاتھوں سے مشک اڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دنیا یہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم — کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں — اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رخ ترا دیتا بہار ہے — شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لیتے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پورا ہے تیرا حکم پڑا دے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے — اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی — اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر — ماہی بزیر آب ہے طائر درخت پر
بے خبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے — دامان دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پر اپنے اونگھ گیا ہے سوار بھی — چوکا ہے بلکہ راہزنِ نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے — عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں — سب آگئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خوابِ عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر — بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر

کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق و برق سے　　رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے　　سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جا بجا تھے جو دُکھ درد پا رہے　　اور پاؤں تک سروں سے پسینے بہا رہے
بارِ گراں غریبوں نے سر پر اُٹھائے ہیں　　جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافر محنت زدہ بہت　　آوارہ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت
آئے ہیں دن کی دُھوپ میں منزل جو مار کر　　رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اُتار کر

اے رات تو نے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اِس وقت اُن بچاروں نے آرام پایا ہے

اِس دم امیرزادے کئی بے نظیر ہیں　　مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں
دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اَور ہے　　پردہ میں شب کے بادۂ گلگوں کا دَور ہے
اک گلعذار سامنے سرگرمِ ناز ہے　　اور جام دے رہی نگہِ نیم باز ہے

کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں　　پر دل کو اُن کے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں
سامانِ عیش سب ہیں مہیا کئے ہوئے　　جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے

مخمل کا فرش ہے مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں ۔۔۔ آرام سے نہ ویتے ہوئے ساماں بہت سے ہیں
دن ہووے یا ہو رات انہیں کام کچھ نہیں ۔۔۔ اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں
وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹینگے رات کو
اور اُن کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے، ۔۔۔ دن پر اُٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے،
تھا صبحدم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو ۔۔۔ وہ حق حلال کر کے گھر آیا ہے شام کو
اب اپنی نان خشک کو پانی میں چور کر ۔۔۔ کھایا ہے اور مست پڑا ہے تنور پر
سر پر قیامت آئے تو اُس کو خبر نہیں
سوناتو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں
یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے ۔۔۔ وہ سب دلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے
بندے خدا کے ایسے یہاں بے شمار ہیں ۔۔۔ دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں
کیجے ذرا خیال کہ اِک اُستاد نکتہ داں ۔۔۔ بیٹھا ہے سر جھکائے بپائے چراغداں
کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی ۔۔۔ مضموں جو ہمدگر ہیں اُلجھتے کبھی کبھی
ہر لفظ کو پہنچاتا ہے معنی نئے نئے ۔۔۔ دکھلاتا زورِ طبع ہے یعنی نئے نئے
لیکن کبھی مقاصد اصلی سے چھوٹ کے ۔۔۔ کرتا ہے آپ ردّ و قدح جھوٹ موٹ کے
بیٹھا حرام کرتے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو
ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں ۔۔۔ کل صبح امتحاں ہے سو اسکے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے ۔۔۔ پڑھتے جدا جدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے ۔۔۔ کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے
جی چھوڑ بیٹھے مرد یہ ہمت سے دور ہے

قسمت تو ہر طرح سے ہے پر محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں — آدھی بچی ہے پر وہ ابھی ہے دکان میں
گنتی میں دام دام کی ہے دم دیئے ہوئے — بیٹھا ہے گو دیں بہی کھاتا لئے ہوئے
ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے بدھ نہیں ملتی چھدام کی

اور دیکھنا نجومی دانا کی شان کو — ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو
اک آنکھ دوربین پہ ہے اک کتاب پر — ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
کٹتی ہے اسکی تارے ہی گن کر تمام رات — پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات
پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں — نکلے نئے ستارے سر چرخ پیر ہیں
اک جنتری بناؤں کہ طرز جدید ہو
چمکے جو اس میں اپنا ستارہ تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں — دزد سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکان میں — اور ہاتھ ڈالا اس کے ہر اک این و آں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر — ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر
لے جائے گا غرض کہ جو کچھ ہاتھ آئیگا
دیکھو کمایا کس نے ہے اور کون اڑائیگا

اس تیرہ شب میں شاعر روشن دماغ ہے — بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے — اڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اتار کر — جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے — ہوجاتے ہیں وہی در مضموں نئے نئے
مضمون تازہ گر کوئی اُس آن مل گیا

یوں خوش ہے جیسے نقشِ سلیمان مل گیا

اِس تیرہ شب کے پردے میں شاعر جو چور ہے — پھرتا ٹٹولتا ہوا مانندِ کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضموں غزل سے ہے — لاتا پر اپنے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے
تعریفیں اُس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں — آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورتِ امّیدوار ہے — اور کرتا صدقِ دل سے دعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض — رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض
یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں — کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کر جاتا صاف دشمن بد بیں پہ چوٹ ہے — اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے
کھوٹا اگر زباں کا ہے دل کا کھرا تو ہے
اتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تو نے سرِ شام آن کر — سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
اور اُس پہ حق پرست جو یادِ خدا میں ہے — بیٹھا رہِ فنا پہ ہوا سے بقا میں ہے
اس کو اسی کی ذات سے ہے لو لگی ہوئی — اور دل میں دمبدم ہے تگ و دو لگی ہوئی
کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے — اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے
بیٹھے اسی کی آس پہ ہیں دل دیئے ہوئے — کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لئے ہوئے

بادِ مراد دیتی ہوائے مُراد ہے　　پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادباں پر　　اور جاتی ہے دُعا کی صدا آسمان پر
یہ سب لگے ہیں بیٹھے ہوا کی اُمید پر
اے ناخدا تو رہیو خدا کی اُمید پر

دل دے رہا جو شیرِ محبت کے جام ہے　　ماں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی　　بچے کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے　　ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اُچھل پڑے
ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

پر جائے حیف حال اُسی جاں بلب کا ہے　　سب جسکو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
دن بھر وہ اغذا میں رہا غیر حال ہے　　لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
بتی چراغ عُمر کی ہے جھلملا رہی　　اور بے کسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے　　اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے
کون اس کا ساتھ دیویگا ہو صبح جب تلک
روئیگا کوئی شام کے مُردے کو کب تلک

آزاد آفریں تری طبعِ زباں کو　　ہر کروٹ اب ہے رات نے دی آسمان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دئے ہوئے　　تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پئے ہوئے
کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقتِ سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

---

# مثنوی موسومہ بہ صبح امید

جب کیا صبح نے روشن فلکِ مینائی
بسترِ خواب سے میں لے کے اٹھا انگڑائی

نکل کر جو نظر کی سوئے میدان جہاں
ذرہ ذرہ میں نظر آیا رخ جانِ جہاں

کام کرتی تھی جہاں تک نگہِ دور انداز
تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمن قدرت راز

سبزہ شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ
جس پہ ہے فرشِ زمیں گلشنِ گردوں کی شکوہ

برگ برگ اس کا ہے آئینہ لئے پیشِ نظر
جن میں ہیں جلوہ نما دل کے مرادوں کے ثمر

آرزوؤں سے کھلے ہیں گلِ رعنا یکسر
جن سے مہکیں گے قرہائے تمنا یکسر

قلۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہمراز
رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہ دراز

تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اسکی
اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اسکی

اسکے چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے
دم اکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے

گرچہ تھا پاؤں اٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

کہ چڑھائی جو نظر آ رہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

جشن شاہانہ کا سامان نظر آتا تھا وہاں
سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں

دل اس آواز پہ اس طرح کھنچے جاتے تھے
گویا ذرے سوئے خورشید کھنچے جاتے تھے

اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آ و چلا
جیسے بلبل سوئے گل کبک سوئے ماہ چلا

کاہ کی طرح سوئے کاہ ربا پہنچا میں
الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا میں

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گلِ خودرو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

مخملِ سبز سے ہے سبزۂ ترپا انداز
رنگِ گل آس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

بر سرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
نہر نہر بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر سے بہا مانِ جبل مار رہا — سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا
سنگِ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی — اس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی
رنگ رخ کو گلِ گلزار سے چمکائے ہوئے — بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے
اس پہ ہے چتر کی جا سایۂ نگنِ سبز نہال — پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال
نوجوانانِ چمن نیم سجاتے ہیں کھڑے — فرش گلہائے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے
سر پہ جو اس کے دھری ہے کلہِ تاجوری — ہے سجاتے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری
اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ — کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ
اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے — ہر دماغ اس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے
رخ جو ہے آئینۂ روئے تمنا اس کا — شمع ساں چاروں طرف آپ ہے جلوہ اس کا
اک طرف عقل ہے اک سمت ہے تدبیر کھڑی — آگے جام لئے غفلت لئے تاثیر کھڑی
دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا — کامیابی کی دکھاتی ہے تصویر جدا
رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اس کی — پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اس کی
ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے — تڑپ اٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے
اس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے — اپنے دامانِ تمنا کو ہیں پھیلائے ہوئے
دمبدم ہے جو نسیمِ سحر آتی جاتی — بوئے امید ہے اک اک کو سنگھاتی جاتی
دل نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھ کو — اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھ کو
دیر تک دل رہا تصویرِ تہِ آئینہ — پیچ جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ
غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے — شجرِ جبر پہ لیکن جو نظر کی میں نے
دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال — دونوں پر کھولے ہوئے ہے یہ ہمائے اقبال
دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوش حالی — آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی
آؤ تم قیدِ تعلق سے ہو آزاد بہت — اپنی وارستگیٔ دل میں ہو تم شاد بہت

آؤ یاں سایۂ اقبال میں لیویں تم کو — لاؤ کیا آرزو سے دل ہے کہ دیویں تم کو
آؤ اس سایہ میں تم ابرِ گہر بار ہے یہ — یعنی شہزادۂ امید کا دربار ہے یہ
اُس کے نغمے سے جو یہ رازِ پُر افسوں نکلا — دل سے بے ساختہ یہ مطلعِ موزوں نکلا
کہ آباد ترے دم سے ہے دائم دُنیا — اور مَثَل ہے کہ بہ امید ہے قائم دُنیا
کہ ہے تیری ہوا میں دلِ شیدا گلشن — لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن
دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا — کونسا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا
کونسا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا — کون انساں ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا
کونسا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں — کونسا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں
کونسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری — کونسا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ تری
تارِ برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے — دیکھا جس ملک میں واں سکّہ ترا چلتا ہے

---

عہدِ آئندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل — غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل
اُس میں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا — اُسی میداں میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا

---

ذرہ ذرہ سے ترے اُگتے ہیں اشجارِ مُراد — خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزارِ مُراد
جب ہے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی — اور ہوا باغ میں ہے خاک اُڑاتی پھرتی
چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے — چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے
ہیرِ دہقاں ہے کہیں بے سر و ساماں بیٹھا — باغباں خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا
ہوتا اُس وقتِ مصیبت میں نہیں یار کوئی — نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی
ہاں مگر تو کہ جب اُس وقت میں آجاتی ہے — جلوہ گر باغِ مراد اُس کو دکھا جاتی ہے
ابرِ تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی — پھلے پھولے اسے اشجار دکھاتی ہے کبھی

کبھی کھیتوں کو ہرا کر کے دکھا دیتی ہے　　کر کے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے
دمبدم تازہ فسوں آ کے سناتی ہے اُسے　　باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اُسے
تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ　　اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یک بار کمر باندھ کے وہ
دھوپیں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا　　کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا
ہر مصیبت میں غرض تو ہے سہارا اُس کا　　تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اُس کا

---

اہلِ ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ　　مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ
کوہ و صحرا میں ہیں وہ زادِ سفر باندھے ہوئے　　اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے
نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا　　اُٹھ گیا اُن کے نصیبوں سے زمانے کا مزا
ہر قدم پر بسرِ راہ خطر ہیں لاکھوں　　ایک جو کھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں
خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی　　صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی
دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ اُنکا　　اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا
ہر قدم تو ہے نگراں کی کمر باندھ رہی　　سمتِ مقصود پہ ہے تارِ نظر باندھ رہی
حسنِ انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں　　کرسیاں جاہ و مراتب کی دکھاتی ہے کہیں
سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے کہیں　　اور خزانے کہیں پُر مال دکھاتی ہے کہیں
کامیابی سے کہیں پھر ہے وطن میں لاتی　　آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی
طائرِ دل پر پرواز ہیں پھیلائے ہوئے　　اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

---

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازار ستیز　　تیغ خونبار کہیں اور کہیں خنجر خوں ریز
ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا　　عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا
نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں منہ مڑ جاتے　　بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اُڑ جاتے

کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے
پہ وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی
ایسا مست مئے جرأت انہیں کر دیتی ہے
کہ نشا آنکھوں پہ چھایا ہے لگاتا گویا
دیتی ہے چشم تصور میں ہر اک کام دکھا
کہ رخ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری
فتحیابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی
شہرت عام کے دربار میں لاتی ہے انہیں
نام پر فتح کے نقارے بجا دیتی ہے
پرچم فتح کبھی لا کے ہے لہرا دیتی
نام اک اک کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں
سیکڑوں دور فلک سر پہ گزر جائیں گے

سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے
ہاتھ میں ہے لئے اک شیشۂ جادو آتی
بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے
سحر فانوس خیالی ہے دکھاتا گویا
ہے پھر اس کام کا دیتی انہیں انجام دکھا
زیب سر دیکھتے ہیں تاج سپہ سالاری
پیش لشکر ہے بسرداری لشکر لاتی
فخر و اعزاز کی کرسی پہ بٹھاتی ہے انہیں
شرق سے غرب تلک اک دھوم مچا دیتی ہے
فتحیابوں کے ہے سر پر اسے جلوہ دیتی
ان کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئیں گے

---

دیکھتی چشم تصور ہے یہ جب باغ مراد
سر بکف بر سر میداں ہیں دلاور آتے
جام دل خون شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
آتے جانباز جو ہیں سر پہ کفن باندھے ہوئے
آب شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں
خوں دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہ جاتے
گرم ہو جاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں
جان و تن موت کے منہ کا ہیں نوالا ہوتے

اور چمک اٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغ مراد
اہل جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے
نعرۂ اہل وغا تا بفلک جاتے ہیں
اور ہوائیں بسر چرخ کہن باندھے ہوئے
اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں
اور جگر سینوں میں خوں ہو کے ہیں رہ رہ جاتے
کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے

فتحیابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے　　اور بہت تن بسرِ خاک ہیں پُرخوں ہوتے
اے امید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے　　یوں ہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

---

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم　　اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالبِ علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے　　حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال　　ذوقِ راحت ہے نہ ہے لطفِ جوانی کا خیال
ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح　　بلکہ پیوندِ ورق ہیں جزِ اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے　　ہاتھ اٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں　　دن ہو یا رات انہیں محنت کے سوا کام نہیں
روز و شب خونِ جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ　　اور بلا بارِ مشقت کے اٹھاتے ہیں وہ
اِن مصائب کی سبب تو ہی انہیں طاقت دیتی　　لطفِ انجام سے ہے حسنِ لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سُرمے کیا کیا　　دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا
اہلِ تصنیف کو ہے عمرِ دوامی دیتی　　بادۂ شوق سے ہے عیشِ مدامی دیتی
سطح کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے　　برگ و بار اس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے
عوضِ آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات　　اور دکھا دیتی ہے اِس طرف سے شادابِ حیات
شہرۂ گلزار زمانہ میں رہے عام اُن کا　　پتے پتے پہ سدا نقش رہے نام اُن کا

---

کبھی طیارِ لیاقت کے ہے تمغے کرتی　　کہیں ایم۔ اے ہے بناتی کہیں بی۔ اے کرتی
بر سرِ کرسیِ دربار بٹھاتی ہے انہیں　　خلعتِ بوقلموں لا کے بٹھاتی ہے انہیں
بزم کو جلوۂ رنگیں سے ہے دکھاتی اُن کے　　اِس طرح فخر سے، اُن سے ہے اُڑاتی اُن کے
ہوتے شاداب ہیں دلہائے فسردہ اپنے　　تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دلِ مُردہ اپنے

کلفتِ محنت و آفت سے ہیں ہم جی جاتے ‍ زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

---

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا ‍ دشتِ پُر خار میں ہے بے سروساماں جاتا

نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لئے ‍ اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لئے

اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اُسے ‍ رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے

طپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینہ میں ‍ بجھ کے رہ جاتا ہے دل مثلِ شرر سینہ میں

دفعتہً آبِ رواں دُور نظر آتا ہے ‍ اور وہ اس لُطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے

کہ دلِ سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا ‍ اور خوشی سے تنِ بے دم میں ہے دم آجاتا

دل جو بیٹھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے ‍ جاتا ہے بے سروپا دوڑتا بیتابی سے

جامِ ہمت جو اُسے تُونے ہیں پلوائے ہوئے ‍ کوسوں اک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے

زورِ ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی ‍ اُتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

---

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے ‍ دلِ مایوس کو جب اُس کے یقیں آجائے

کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ ‍ سرِ دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ

یہ سمجھتے ہی تیرہ اندھیر جہاں آنکھوں میں ‍ ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں

دل میں ہمت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی ‍ صورتِ نقشِ قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی

جان پانی میں ہوا انکی ہوئی دم سینہ میں ‍ وہ بھی پھنسنے سے آکر رہے تھم سینہ میں

اُس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تُو ‍ سرِ بالین وہ مسافر کو تُو لاتی ہے تو

حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آتا ‍ ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا

اُس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اُسکے لئے ‍ ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اُسکے لئے

---

کرتے زاہد ہیں خدا کی جو عبادت دن رات ۔ ترکِ دنیا سے ہیں سرگرم ریا صنت دن رات
ذکرِ فردوس ہیں تو نے انہیں سنوائے ہوئے ۔ لطف ہر دم ہیں وہی پیش نظر آئے ہوئے
رندِ آزاد جو ہر دم ہے گرفتارِ گناہ ۔ بارِ عصیاں سے ہے بے چارہ گرانبارِ گناہ
نہیں جز رحمتِ حق کوئی سہارا اُس کا ۔ تیری ہی چشمِ کرم پر ہے گزارا اُس کا
تو نہ ہووے تو تڑپ کر دلِ مضطر رہ جائے ۔ وہ گنہگار تو غم سے ابھی مر کر رہ جائے

---

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سرو کار سدا ۔ کارِ اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا
ہے شبِ تار تو سونے سے انہیں کام نہیں ۔ دن کو جز فکرِ مضامیں کبھی آرام نہیں
لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے ۔ اور یہ بیٹھے دُرِ مضمون ہیں پرویا کرتے
یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اُٹھائے بیٹھے ۔ یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے
باغ سبزا پنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے انہیں ۔ مژدۂ خلعت و انعام سناتی ہے انہیں
انہیں مطلب نہیں پر اور کسی بات سے ہے ۔ ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے
کہ جو آہ اُن کے دلِ سوختہ جاں سے نکلے ۔ یا کوئی نالۂ موزوں کہ زباں سے نکلے
اثر درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا ۔ اور جگر درد سے لبریز اثر ہووے سدا
ہووے اسیر بھی جو آشوبِ جہاں حد سے زیادہ ۔ قول آزاد سے کرتی ہے انہیں یوں ارشاد
کہ سخن فہم تہِ چرخِ بریں ہوئیں گے ۔ خوردہ بیں ہیں تو سخنداں بھی یہیں ہو بیٹھے

داد مل جائیگی جب اور کوئی دیکھے گا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھے گا

# مثنوی حُبِّ وطن

ہے قول جُملہ تجربہ کارانِ فارسی — اَور کہتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی
حبِّ وطن ز ملکِ سلیماں نکوتر است — خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است
سلطانِ دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے — اور شفق اسی پہ زمانہ تمام ہے
پر ملکِ مصلحت کا ہے کچھ انتظام اور — اِس سلطنت کو چاہیئے طرزِ نظام اور
حُبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے — نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے
حبِّ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو — ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو
یا ہو گُہر جو ٹوٹتا دریا کی یاد میں — داخل ہو وہ بھی زمرۂ اہلِ وداد میں
حبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ دید — آرام جان و تن کو جو سمجھیں گھروں میں عید
آبِ خنک ہو سامنے اور نانِ گرم ہو — اور وقتِ خواب فرش بھی سونے کو نرم ہو
یہ اُلفتِ وطن نہیں ہرگز کہ باغ میں — سودا ایک سا ئے بلبلِ شیدا دماغ میں
آخر شکارِ دام ہو گلشن کو چھوڑ کر — یادِ چمن میں جان دے سر پھوڑ پھوڑ کر
حُبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش — یادِ وطن میں ہووے گہے جوش گہ خروش
بچوں کی طرح روتے سدا زار زار ہوں — اور مادر و پدر کے لئے بے قرار ہوں
اہل و عیال کا نہ گوارا فراق ہو — اور یار کا فراق بہت دل پہ شاق ہو
حُبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں — بچوں کے مُنہ کو چُومتے آٹھوں پہر رہیں
ہے کوئی گود میں کوئی گردن کا ہار ہے — بی بی کہیں میاں کو بہت مجھ سے پیار ہے
روئیں سفر میں دوست گہے یار کیلئے — اور گاہ سیر کو چۂ بازار کے لئے

---

اے دوست یہ تو دوستیٔ سنگ و خشت ہے — یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

آیا یہ دھیان آج جو وقتِ سحر مجھے ۔۔۔ اک نقل یاد آگئی اِس اصل پر مجھے

دلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے ۔۔۔ جو باکمال اُس میں ہے وہ بےمثال ہے
اک شخص واں ستارنوازی کی جان تھا ۔۔۔ پر جان سے عزیز تھا دلّی کو جانتا
آیا دکن سے خلعت و زر اُس کے واسطے ۔۔۔ اور نقد بہرِ زادِ سفر اُس کے واسطے
ہر چند منہ تو دلّی سے موڑا نہ جاتا تھا ۔۔۔ پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا
مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے ۔۔۔ اسباب سارا راہ سفر کا سنبھال کے
دلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے ۔۔۔ پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے
پہنچے مگر ابھی تھے دریراج گھاٹ پر ۔۔۔ جو دفعۃً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر
دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا اُن کا دل ۔۔۔ اور دلّی چھوڑتے ہوئے بھر آیا اُنکا دل
منہ پھیر کر نگاہ جونہی شہر پر پڑی ۔۔۔ جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی
تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا ۔۔۔ اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا
دیکھا نگاہِ یاس سے اور اُس سے یہ کہا ۔۔۔ پیچھے چلینگے پہلے مگر یہ تو دو بتا
ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں ۔۔۔ منہ دیکھکر وہ اُن کا ہنسا اور کہا کہ نہیں
پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا ۔۔۔ مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا
وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے ۔۔۔ اِس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے ۔۔۔ اتری زمیں پہ جس کی شبیہ آسمان سے
یہ بات اُسکی سنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے ۔۔۔ اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے
جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں ۔۔۔ سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں
اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں ۔۔۔ پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں
اور گاڑی اپنی تو بھی میاں [illegible] ۔۔۔ گر اب پھرے نہ یاں سے تو قسمت کا جانو پھیر

ہم اپنی دلّی چھوڑ دکن کو نہ جائینگے — گر یاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

---

ایسے ہی ننگ حبّ وطن بدنصیب ہیں — گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں
کہتے ہیں دُکھ اُٹھانا ہو یا درد سہنا ہو — تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو
اب میں تمھیں بتاؤں کہ حُبّ وطن ہے کیا — وہ کیا چمن ہے اور وہ ہوائے چمن ہے کیا
وہ رحمتِ خدا ہے کہ بندوں پہ عام ہے — وہ لطفِ عام جس سے جہاں شاد کام ہے
وہ نورِ مہر جس سے زمانہ میں نور ہے — وہ نور ذرّہ ذرّہ پہ جس کا ظہور ہے
حبِ وطن ہے جلوہ اُسی نورِ پاک کا — اور روشن اُس کے نور سے عالم ہی خاک کا
ہو مہر میں یہ نور تو اُس کو کرن کہیں — گر دل سے جلوہ گر ہو تو حُبِّ وطن کہیں
رکھتا جو سب پہ لُطف و کرم کی نگاہ ہو — اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو — ہاتھ اپنا جیبِ نفع میں ہو یا ضرر میں ہو
ہر حال میں رہیں اُسے اہلِ وطن عزیز — اور ہو دیں نیک و بد در وطن جان و تن عزیز
حبِ وطن کے ملک میں فرمانروا ہے وہ — تاج و سریر ہو کہ نہ ہو بادشاہ ہے وہ
اور جس وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینہ میں — اس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینہ میں
لیکن یہ راز اہلِ حقیقت سے پوچھئے — اس کا طریق پیرِ طریقت سے پوچھئے
دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا — ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا
حبّ الوطن کی راہ میں گرم نفس ہے یہ — نالاں غمِ فراق سے مثلِ جرس ہے یہ
یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتہ کہاں — بلبل تھا کس چمن کا میں اور آ پھنسا کہاں

---

جنت سے آئے آدم و حوّا زمیں پہ تھے — رکھتے جو قبضہ گلشنِ خلدِ بریں پہ تھے
میراث اپنی گلشنِ جنت کا باغ ہے — حق ہے اگر فراق سے دل داغ داغ ہے

پر آفریں ہے حضرتِ انساں کی ذات کو بھولے نہیں ہیں آج تلک اپنی بات کو
بیتے وطن پہ قبضہ ہیں دے دے کے جاں تلک آخر پہنچ ہی رہتے ہیں باغِ جناں تلک

---

آزاد خیر ہے کدھر آیا خیال ہے تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے
جانا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں
دُنیا ز بسکہ مزرعِ عقبےٰ تمام ہے سرسبز کرنا اس میں بھی لازم کلام ہے

---

لکھتے ہیں اس طرح سے مورخ فرنگ کے وا نار موز معرکۂ صلح و جنگ کے
یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے دونوں کے اہل ملک مگر جاں نثار تھے
سرحد پہ کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا دونوں کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا
آخر کو تھے جو واقفِ اسرارِ سلطنت سمجھے بہم یہ مصلحتِ کارِ سلطنت
دو جاں نثارِ ملک روانہ اُدھر کریں اور اپنے وہ ادھر کو وہ گرمِ سفر کریں
تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں سرحد ملک کے وہیں قائم منار ہوں
جاں باز اُس طرف کے مگر جان توڑ کر ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر
اک حصہ طے نہ رستہ حریفوں نے ہٹا لیا یہ تین حصہ بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا
لیکن حریف شرط کے میداں کو چھوڑ کے بولے یہ عہد قول و قرار اپنا توڑ کے
دو اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں پھر اب کے دو طرف سے رواں ایکبار ہوں
پر اپنی بات پہلے ہر اک شخص جان لے اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے
یعنی جو شرط جیت کے خورسند ہو بڑ گا سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہو سکے گا
جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے حب الوطن کے جوش سے بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی اور بات جو کہ ہونی ہے پھر وہ ابھی سہی

پر پیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو / سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونوں اسی جا پہ اڑ گئے / جیتے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

---

اور ہے لکھا مؤرخِ عہدِ قدیم نے / روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے
تیار اہلِ فوج سپہ کارزار تھے / پر اہلِ ملک اُن سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریبِ شہر / اُٹھے برائے جنگ امیر و غریبِ شہر
پر اُن میں کوکلیسنہ جو مردِ دلیر تھا / حبِّ وطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا
نکلا وہ سج کے اسلحہ جنگ اپنے شہر سے / اور لشکرِ عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثارِ حبِّ وطن اور ساتھ تھے / اعدا کے خوں میں ڈوبے ہوئے جن کے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحرِ گنگ کا مائی لقب یہاں / تھے ٹائبر کو باپ کہا کرتے سب وہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر / پل سے اتر کے آتے یہ دشمن کی فوج پر
پل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے / اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ کے
اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم / حملہ تو ہم نے روک لیا پل گراؤ تم
مسمار ادھر وہ کرتے رہے پل کو آن کر / یہ تیر و نیزے مارتے گئے تان تان کر
پل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا / اک آدمی کا راہگذر جب کہ رہ گیا
تب کوکلیسنہ یاروں سے بولا کہ جاؤ تم / اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم
قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو چھوڑ دو مجھے / تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے
اک اک رفیق جب کہ ادھر پار ہو گیا / اور پل جو پیچھے رہا تھا وہ مسمار ہو گیا
للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے / اور ٹائبر میں کہہ کے یہ کودا دھڑام سے
ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو / اے میرے باپ تھامیو اپنے سپاہی کو
دشمن کی فوج سنگینیں سنبھالے ہی رہ گئی / اور موت اپنے دانت دکھا سہم ہی رہ گئی

دیکھو تو فیض حبِ وطن اُس کو کیا ملا — جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

---

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دل لالہ زار تم — اور ہو یہ تیغِ حبِ وطن دل فگار تم
ایرانیوں کے عہدِ کیانی کو دیکھ لو — اُس عہدِ سلطنت کی روانی کو دیکھ لو
کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو — کیا کیا عروج دے کے بڑھایا ہے ملک کو
کیا کیا خجل کیا ہے سپہرِ بنفش کو — کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو
اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کیا آبدار کیں — کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں
ان میں بھی بیستاں کے بہادر وہ شیر تھے — جن سے کہ اک جہان کے زبردست زیر تھے
کرتے تھے عیش دامنِ کہسار میں کبھی — اور لوٹتے تھے سبزۂ گلزار میں کبھی
مثلِ غزال دشت میں کرتے کلیل تھے — جنگِ پلنگ و شیر اُنہیں بچوں کے کھیل تھے
آبِ رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے — تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے
پر سنتے جب کہ شاہ بعزمِ غنیم ہے — یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے
درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں — ہوں گھر میں یا کہ وادیِ نزدیک و دور میں
جس حال میں ہوں بے سر و پا اُٹھ کے دوڑتے — روئے زمیں سے مثلِ ہوا اُٹھ کے دوڑتے

---

اور ان میں شانِ رستمِ دستاں کی دیکھئے — اُلفت وطن سے شیرِ نیستاں کی دیکھئے
وہ جس طرف بپھر کے بشکلِ بلا چلا — بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلا چلا
وہ گرزِ گاؤ سر کو دھرے قاشِ زین پر — لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاوِ زمین پر
ریشِ دوشاخ دوش پہ ہوا پر اڑی ہوئی — افعی کے پیچ و خم میں وہ مونچھیں مڑی ہوئی
فولاد کا وہ خود جو کلہ تھا شیر کا — کرتا فزوں تھا دبدبہ گُردِ دلیر کا
بر میں وہ چرمِ شیر کا خفتان پھنسا ہوا — اور پائے عزم نافِ زمیں میں دھنسا ہوا

پاکھڑ پڑی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی — اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی ڈھال کی
جانا چھڑانے شاہ کو مازندران میں — لڑنا وہ دیو و دد سے رہِ ہفت خوان میں
وہ بار بار معرکے افراسیاب سے — ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے
جب گرم کارزار ہوا خوں بہا دیئے — اور دشمنوں کے خون سے جیحوں چلا دیئے
وہ سیستاں کا شیر عجب کام کر گیا — حب الوطن کے معرکہ میں نام کر گیا

---

ہر چند شہرہ خلق میں رستم کا عام ہے — اور لیتا آج تک بھی ہر اک اُس کا نام ہے
پر جو وہاں دلاور فرخندہ کام تھے — حب الوطن کے رستم دستان و سام تھے
جب سنتے تھے کہ شاہ کہیں گرم جنگ ہے — یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے
سوتے ہوں یا کہ بیٹھے ہوں یا مست خواب ہوں — یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں
حب الوطن کے جوش میں ہر کام چھوڑ کر — چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر
اور معرکہ میں جنگ کے بھر جوش عزم میں — گرز و کمند و تیغ سے میدانِ رزم میں
لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جان کھوتے تھے — اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے
میدانِ جنگ جیت کے ہمت کے داؤں میں — لاتے تھے اپنے شاہ کو تیغوں کی چھاؤں میں
چہروں کو رنگ دے کے گلِ نوبہار سے — جاتے تھے گھر کو معرکۂ کارزار سے

---

حب الوطن ہے نور میں ہمنور آفتاب — اور کرتا ہے ظہور بدستور آفتاب
اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے — اک جا جو روشنی ہے تو اک جا اندھیر ہے
آج اُس کا آفتاب ہے اوجِ فرنگ پر — اور رات ہند کی ہے رخِ تیرہ رنگ پر
ہے کچھ حساب اور وہاں کی کتاب کا — رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا
جانباز ہیں تو بہرِ وطن جاں نثار ہیں — اور تیغِ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں

قائم ہو تاکہ دبدبہ اہلِ غرور پر    اور بیٹھے سکّہ ملک کا نزدیک و دور پر
وہ مال کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو    دیتے ہیں شان اپنے وطن کے نشان کو

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت    ہیں دل میں رکھتے مایۂ دانشوری بہت
ٹپکاتے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں    اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں
تا ہو پئے سراب وطن آب جو نصیب    اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو نصیب
شائستگی کے ساتھ رواجِ کمال ہو    علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

---

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں    ہر چند فکرِ مال میں لیل و نہار ہیں
کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مال و جان کو    طے کرتے ہیں بپائے سیاحت جہان کو
لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکرِ زر انہیں    حب الوطن کا نقش ہے پیشِ نظر انہیں
کرتے ہیں دانہ دانہ بہم خوشے خوشے سے    اور ذرّہ ذرّہ ڈھونڈتے ہیں گوشے گوشے سے
چُنتے ہیں ساتھ مال کے علم و ہنر کے پھول    تاکہ گلشنِ وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول
دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا    اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہلِ وطن سدا

---

ایسے بھی اُن میں صاحبِ بخت و نصیب ہیں    دار الشّفائے حُبِّ وطن میں طبیب ہیں
عالم میں بہرِ تجربہ پھرتے ہیں گشت کو    اک اک قدم میں ماپتے وہ کوہ و دشت کو
ہیں ذرّہ ذرّہ چھانتے دریا و کان کا    ہیں برگ برگ دیکھتے باغِ جہان کا
ہیں گاہ گاہ ڈال میں گہ پات پات میں    ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں
اک اک ورق میں صورتِ تحریر دیکھتے    اور اُس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے
تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا    اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا

پر اُن میں وہ ہے زینتِ تاجِ نگیں سدا — اور زیبِ سر ہیں اُس کے گُلِ آفریں سدا
لایا جو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں — آیا وطن کو چھوڑ کے ہندوستان میں

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے ملک — اور غیرتِ نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا — یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
اِس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں — تھا مبتلا وہ ایک مرض لاعلاج میں
سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے — سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے
پر اِس مسیح دم نے جو آ کر کیا علاج — ایسا بحسبِ طبع موافق پڑا علاج
گویا دوا سے کارِ دُعا ہو گئی اُسے — اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے
نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں — اور جان تازہ آ گئی اک اک کی جان میں
فرخ سیر کہ شاہ سخاوت مآب تھا — بحرِ کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا
اک جشنِ عام اُس نے کیا دھوم دھام سے — اور شورِ تہنیت کا اُٹھا خاص و عام سے
حاضر ہوئے امیر و وزیر آ کے سامنے — اور اُس طبیب کو کہا بلوا کے سامنے
لا دامنِ امید کہ بھر دیں ابھی اُسے — تا عمر بھر نہ پائے تو خالی کبھی اُسے
دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا — ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پر نظر ذرا
حب الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا — دل آب ہو کے سینہ میں سیماب ہو گیا
کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی — بندہ کو آرزو نہیں کچھ عز و جاہ کی
زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے — پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے
کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو — جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو
بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے — جو مانگتا ہے مانگ تجھے اختیار ہے

تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے — روشن جلال شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی زمیں نواحیٔ دریا کنار میں — مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہریار میں
تا اِس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں — اور اُن میں تاجرانِ ذوی الامتیاز آئیں
کچھ اُن پہ ہووے راہ نہ بیمِ زوال کو — آرام سے اُتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دُور سے — محصول سب معاف ہو اُس کا حضور سے

---

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا — پر نسخہ لیکن اُس سے سوا پُر اثر پڑا
اُس کی بھی یعنی کلفتِ غم دُور ہو گئی — اور تھی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہو گئی
ہرچند اُسے نہ فائدۂ سیم و زر ہوا — پر نفع بہرِ اہلِ وطن کس قدر ہوا
دامن میں اک عطائے خداداد پڑ گئی — اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی
نوبت بجا کرے گی سدا صبح و شام کی — آواز دیں گے طبل مگر اُس کے نام کی

---

اے آفتابِ حبِّ وطن تُو کدھر ہے آج — تُو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہان ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا — اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مُردہ ہو رہے — اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے — کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حُبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں — حیراں ہوں آجکل ہے پڑا اسکا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں — حبّ الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں — جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو — اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
عالم سے تاکہ تیرہ دلی دُور ہو تمام — اور ہند تیرے نور سے معمور ہو مدام

اُلفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم — اور جو کہ ہموطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور — اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور
سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں — اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں — اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں
بریز جوشِ حُبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشار ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

## مثنوی خوابِ امن

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا — دل نے بھی کرسئ آرام پہ آرام لیا
یں کہ دن بھر کی مصیبت سے تھکا ماندہ تھا — مکتبِ دید کا پرستائی ناخواندہ تھا
دمبدم دورِ فلک تازہ سبق دیتے گویا — رات دن مجھ کو زمانے کے ورق تھے گویا
شبنمِ امن و اماں سے کبھی شاداب جہاں — اور کبھی شعلۂ آفات سے بیتاب جہاں
بود و نابود جو نظروں میں تُلے جاتے تھے — سفئ کون و فساد اُس میں کھلے جاتے تھے
دفعتہً سامنے لیلائے شبِ تار آئی — کرتی ایک اک کو مئے شوق سے سرشار آئی
گرچہ لائی تھی نہ ساماں مئے بیہوشی کا — ہاتھ میں شیشہ تھا بردارو ئے بیہوشی کا
چال سے سرمۂ حیرت کے غبار اڑتے تھے — حال سے دیدۂ غفلت کے خمار اُڑتے تھے
ایسے انداز سے دامن تھی ہلاتی آتی — سب کو تھی امن کے سایہ میں سلاتی آتی
اُس کا جھونکا ہوا غفلت کا حجاب آنکھوں پر — خوابِ شیریں نے کیا کار نقاب آنکھوں پر
خواب گو کارِ جہاں میں خلل انداز ہوا — پر خیالاتِ دلی کو پرِ پرواز ہوا
ذوقِ گلگشت کا اک دے کے اشارہ مجھکو — لیسے گلزاروں میں لے جا کے اُتارا مجھکو

کہ نہ تھا فصلِ بہاری پہ سہارا اُن کا
تھا چمن بندِ طبیعت چمن آرا اُن کا

اُس قلمرو میں رواں تھا قلمِ امن و اماں
پتّے پتّے کے ورق پر رقمِ امن و اماں

پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا
موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا

سرکشی سروِ سرافراز دکھاتی ہی نہ تھے
سینہ زوری سے بگولے اِدھر آتے ہی نہ تھے

زلفِ سنبل کی سیہ تھی پہ سیہ کار نہ تھی
خم تو تھے اُس میں مگر پیچ سے خمدار نہ تھی

سرِ شمشاد کا طرّہ وہاں طرّار نہ تھا
شوخیِ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا

دھوپ کا رنگ چمکتا تھا تو ٹل جاتی تھی
اور نسیم آ کے دبے پاؤں نکل جاتی تھی

صبح یہ تاب نہ رکھتی تھی کہ دم مار سکے
یا صبا پاؤں کی آہٹ سے قدم مار سکے

پر جب آتی تو شگوفہ بھی نیا لاتی تھی
ایسا کچھ پھونک کے کانوں میں چلی جاتی تھی

ہنستے تھے پھول پہ کھلتی گرہِ راز نہ تھی
لوٹ جاتے تھے نکلتی مگر آواز نہ تھی

مرغ واں نغمۂ بے صوت و صدا گاتے تھے
اور شجر موجِ ہوا میں پڑے لہراتے تھے

برگ سے برگ و لیکن نہ کھڑک سکتا تھا
خار کی نوک میں دامن نہ اٹک سکتا تھا

لوریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے
سوتے آرام سے تھے عیش کے بندے سارے

باغباں قدرتِ حق کا تھا جو آیا اُس جا
تختہ اک تھا گُلِ خودرو کا لگایا اُس جا

دامنِ کوہ سے چشمہ جو ہوا تھا جاری
آبِ شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری

اس پہ جھرمٹ میں درختوں کے لبِ جو کی بہار
اور لبِ جو پہ وہیں سبزۂ خودرو کی بہار

شیر بکری وہاں اک گھاٹ تھے پانی پیتے
جامِ الفت تھے بہم دشمنِ جانی پیتے

جلوہ گر بیچ میں اک قلعۂ شاہنشاہی
گنبدِ امن تھا یا گنبدِ بسم اللّٰہی

در و درباں کی ضرورت تھی نہ زنہار وہاں
پاسباں امن کا دن رات تھا ہشیار وہاں

## ۱۷ خسروِ امن کا دربار

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت — امن کو سمجھا غنیمت دلِ غم دیدہ بہت
شوقِ دل لیکے غرض قصر میں آیا مجھ کو — پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھ کو
خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار — دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار
اُس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا — آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا
نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا — مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا
گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا — دھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا
صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں — نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں
ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہاں ہر دم آگے — آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے
دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار — کرتے تھے نظم و نسق جملہ برائے دربار
دل میں افکارِ پریشاں کا نہ تھا نام وہاں — ہاتھ جمعیتِ خاطر کے تھے سب کام وہاں
مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے — دامنِ امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چُنتا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

## علم امن کا شکریہ کرتا ہے

دفعۃً دیکھا کہ اک پیر کہن سال آئے — پر عجب شان سے اک مردِ خوش اعمال آئے
چشمِ پُرنور میں پہنے ہوئے جامہ کالا — بر میں جبہ عربی سر پہ عمامہ کالا
پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا — اُن کی مقدارِ فضیلت کو بتا جاتا تھا
لاغری چہرے پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت — رُخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ نفاریش مقدس میں کیا پیری نے — اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے
ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اٹھائے آتے — اور بغل میں کئی جزدان دبائے آتے
سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے — ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے
الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے — پہلے سب نے بہ ادب دستِ دعا پھیلائے
پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے — علم نے بھیجا ہے تقدیم رسالت کے لئے
اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا — ہے ہر اک شہرتِ تعریف سے مصروف سدا
اہل تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں — اور جہاں میں انہیں فکرِ سحر و شام نہیں
دمبدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے — آتے ہیں کارگہِ دہر میں استاد نئے
درس و تدریس کے چرچے ہیں جو گھر گھر جاری — ہیں یہ جمعیت خاطر کی ہی باتیں ساری
جو ہمیں چاہیئے موجود ہیں سارے ساماں — ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں
اے شہِ امن یہ سب فیض کرم تیرے ہیں — کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں
تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے — سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

## زراعت شکریہ کرتی ہے

تھا انہوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا — اور نہ تھا علم نے طومار لپیٹا اپنا
دیکھا انبوہ ہے اک حد سے زیادہ آتا — ہے سوار ان میں کوئی کوئی پیادہ آتا
گھوڑیاں آگے سواری میں بچھیرے پیچھے — اور کئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے
گود میں ہے کوئی گوسالہ اٹھائے آتا — کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا
نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں — نئی فصلوں کے اناج ان میں بھرے لاتے ہیں
طرّے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے — بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے

ہمّت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں اُنکے
تندرستی کے نشاں منہ پہ عیاں ہیں اُن کے

دیکھ انہیں سب علماہٹ کے کنارے آئے
بے تکلف سرِ دربار وہ سارے آئے

اور کہا سب نے کہ اے بادشہِ امن و اماں
تجھ سے جاری ہے زمانے میں رہِ امن و اماں

کرکے طے گھر سے بہت فرسخ و میل آئے ہیں
جانبِ اہلِ زراعت سے وکیل آئے ہیں

کہ وہ صحرا میں جو ہیں بیٹھے سہارے تیرے
آسرے رکھتے ہیں دن رات بچارے تیرے

کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں
گھر میں ہیں تو تو ترا شکر ادا کرتے ہیں

تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے
خاک پر آبِ زمرد کو بہا جاتا ہے

کشتِ امید زمانہ کی ہری ہے تجھ سے
سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے

پیرِ دہقاں کہ جو ہے سایہ میں تیرے بیٹھا
جان و مال اپنا ہے مٹی میں بکھیرے بیٹھا

سایۂ امن ترا اُس کو ہرا رکھتا ہے
صرصرِ فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے

تو بچاتا ہے زمانے کی لگد کوبی سے
تُرکتازِ اِن حوادث کی پُر آشوبی سے

فیضِ رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اُسے
زور تیرا ہے کہ زر کر کے اُٹھاتا ہے اُسے

کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو
تو ہی اک دانے سے ہے پالتا سو دانوں کو

تو نہ ہووے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلقِ خدا کال سے بدحال تمام

## تجارت شکریہ کرتی ہے

سخن اُن کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی
اور زراعت نے یہ خرمن نہ اُٹھایا تھا ابھی

لوگ کچھ اور بھی آئے پئے تقریر وہاں
دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں

گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتاتے تھے وہ سب
مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب

کہ ابھی قطع کئے راہ سفر آئے ہیں
ریل سے یا کہ جہازوں سے اُتر آئے ہیں

تھا کوئی دوش پہ خُرجین اُٹھائے آتا — اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا
رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلودہ — دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلودہ
دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لئے — تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پے شاہ لئے
خسروِ امن کے دربار میں جب آئے وہ — بعد آداب زباں پر یہ سخن لائے وہ
اے شہِ امن دُعا خلق خدا کرتی ہے — اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے
کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری — شرق سے غرب میں جنسیں ہیں پہنچتی ساری
ہم اُٹھا لیتے ہیں نفع درم و دام اُن سے — اور جو گھر بیٹھے ہیں وہ پاتے ہیں آرام اُن سے
کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے — کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے
رہے جس جا پہ مسافر کے لئے گھر ہے وہیں — شیر کنجشک جو چاہو تو میسر ہے وہیں
نہیں اصلا خطرِ رہزنی و دہر اُنہیں — ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر انہیں
کوئی دم لیتا ہے رستہ میں کوئی سوتا ہے — پر کہیں کیل کا کھٹکا بھی نہیں ہوتا ہے
اے شہِ امن اگر لطف ترا عام نہ ہو — اور تری نظم پہ عالم کا سر انجام نہ ہو

ابھی بازارِ جہاں زیر و زبر ہو جائے
خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

# صنعت و دستکاری

تھی نہ بات ان کی ابھی ختم پہ آنے پائی — اور تجارت یہ دُکاں تھی نہ بڑھانے پائی
لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے — لیکن اس رنگ سے وہ داخلِ دربار ہوئے
جیسے تختہ ہو گُلِ بوقلموں کا آتا — یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا
خاک پر تھے گُلِ ایجاد لگاتے آتے — پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے
دستکاری نے کیا لعبتِ چیں تھا اُن کو — رنگ چمکا کے کیا نقش نگیں تھا اُن کو

چشمِ صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر ‏— ضعفِ بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر
تھے لئے نذر نہ کچھ گو ہر و زر ہاتھوں میں ‏— دستِ صنعت کے تھے گلدستۂ تر ہاتھوں میں
غرض آ کر سرِ تسلیم جھکائے سب نے ‏— پیشکش لیکے جو آئے تھے دکھائے سب نے
کر چکے شاہ کا جس دم حقِ نذرانہ ادا ‏— تب کیا جانبِ صنعت سے یہ شکرانہ ادا
اے شہِ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا ‏— کہ اسی سائے میں اپنا بھی ہے بازار کھلا
دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے ‏— کام سب تیری بدولت ہیں ہمارے چلتے
تار ہے غیب کے اخبار سنائے جاتا ‏— ریل کا تختِ سلیماں ہے اڑائے جاتا
کارخانے جو بڑے چلتے ہیں دن رات یہاں ‏— اور کلیں کر رہی جو جو ہیں طلسمات یہاں

اے شہِ امن یہ تیری برکت ہے ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں حرکت ہے ساری

## دولت شکریہ کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری ‏— زرِ تقریر یہ سب تھے کر رہے میناکاری
دفعۃً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر ‏— ہو گئے سب در و دیوار طلائی یکسر
جیسے جھڑتے کبھی گلبن سے ہیں گلزار میں پھول ‏— چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول
کہ پری اتنے میں اک دوشِ ہوا سے آئی ‏— آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی
حُسنِ رفتار سے تھی سرعتِ سیماب اڑتی ‏— جائے دامن تھی فقط چادرِ مہتاب اڑتی
حُسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اس کا ‏— پر سراپا تنِ نازک تھا طلائی اس کا
ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اڑاتی چلتی ‏— بلغ نرگس دمِ رفتار کھلاتی چلتی
تھی نہ تھمتی روشِ گردشِ ایام اک جا ‏— لینے دیتی نہ تھی شوخی اسے آرام اک جا
جب کہ وہ غیرتِ نورِ سحری آ پہنچی ‏— پڑ گئی دھوم کہ دولت کی پری آ پہنچی

سامنے بادشہِ امن کے جب دم آئی — حُسن شکرانہ میں یہ فتنۂ دلکش گائی
کہ جہاں تیری بدولت ہے ہر اک حال میں خوش — ہے کوئی شال میں خوش اور کوئی کھال میں خوش
گھر مہاجن کا جو لاکھوں سے ہے معمور سدا — خوش ہے دو پیسے کی مزدوری میں مزدور سدا
زیردستوں کو ترے سائے میں خوش مستی ہے — اپنا سر پیٹتی ہاتھوں سے زبردستی ہے
ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا — مار کیا تاب جو بل مارے سرِ مور ذرا
بند و بستوں کا ضرر کچھ نہیں نقصانوں سے — ہاتھ ہیں دست درازی کے جدا شانوں سے

ہے ترے نظم و نسق سے جو نظامِ عالم
شربتِ عیش سے معمور ہے جامِ عالم

## فتنہ انگیزی غدر و آشوب کی

تھی پری زمزمۂ شکر سے دمساز ابھی — کہ عیاں جانبِ صحرا سے اک آواز ہوئی
وہ صدا سنتے ہی فق ہو گیا دربار کا رنگ — اور ہوا ہو گیا یکسر گل و گلزار کا رنگ
اہلِ دربار کہ تھے بزم جمائے بیٹھے — غم و افکار سے ہاتھ اپنے اٹھائے بیٹھے
مضطرب ہو کے ہر اک جانبِ آواز چلا — مرغِ دل میرا بھی کھولے پرِ پرواز چلا
چلتے چلتے غرض اک دشت نظر آیا ہمیں — ماجرا دیدۂ عبرت نے یہ دکھلایا ہمیں
یعنی اک مردِ دلاور ہے سرِ کوہ کھڑا — اور سرِ کوہ ہے گرد اس کے اک انبوہ کھڑا
تمتمائے ہوئے ہیں دھوپ سے رخسار اسکے — لال انگارے ہیں وہ دیدۂ خونخوار اسکے
بدن اینٹھا ہوا ابھرا ہوا سینہ اس کا — کہ سدا مشقِ مشقت ہے قرینہ اس کا
خسروِ امن سے ہے بسکہ بندھی لاگ اسکی — کودا گھوڑے سے ہوا اور پکڑے ہے خود باگ اسکی
نیزہ ٹیکے ہوئے ہے سب پہ نظر ڈال رہا — ہر نظر سے ہے شرارت کے شرر ڈال رہا

اور یہ کہتا ہے کہ اے امن کے بندو آؤ — آؤ اے راحت و آرام پسندو آؤ
آؤ جلد آؤ کہ ہم مرد بنائیں تم کو — جامِ جرأت خُمِ ہمت سے پلائیں تم کو
کر دیا سلطنتِ امن نے بزدل ہی تمہیں — نہ رکھا عیش و طرب نے کسی قابل ہے تمہیں
رات دن رہتے ہو آرام کے سامانوں میں — دن کو گلشن میں ہو اور شب کو شبستانوں میں
خوابِ غفلت میں ہو تم پاؤں پسارے سوتے — ہمت و عزم کبھی ہیں ساتھ تمہارے سوتے
جرأت و حوصلہ سے تم کو رہا کام نہیں — ملک میں زور ترقی کا کہیں نام نہیں
خسروِ امن کی خدمت میں زمیں چومتے ہو — رات دن بیٹھے افیمی کی طرح جھومتے ہو
اس عمل نے ہے جوانی میں کیا پیر تمہیں — کیا بے قید ہے وابستۂ زنجیر تمہیں

---

آؤ اس قیدِ بلا سے تمہیں آزاد کروں — اور ابھی صاحبِ اقبال خداداد کروں
زورِ بازو سے تم آفاق کو تسخیر کرو — دستِ تقدیر کو وابستۂ تدبیر کرو
عیش نے ہے جو تمہیں جان سے رنجور کیا — ضعفِ دل نے تمہیں ہمت سے ہے معذور کیا
کر دیا امن نے جو عیش کا پابند تمہیں — اور کیا بسترِ راحت کا ہے پیوند تمہیں
میں جہانگیر و جہاں گرد کروں گا تم کو — مرد اگر ہو تو جواں مرد کروں گا تم کو
ناپ ڈالو گے انہیں قدموں سے میدانِ جہاں — ایک کر دو گے ابھی دشت و بیابانِ جہاں
اپنے ہر کام کو آرام میں کھویا تم نے — ملک کا نام زمانے میں ڈبویا تم نے
میں ابھی خاک سے افلاک پہ پہنچاؤں گا — مثلِ خورشید جہاں میں تمہیں چمکاؤں گا
گرچہ تھا خلق میں آشوبِ جہاں نام اس کا — فتنہ انگیزیٔ عالم تھا سدا کام اس کا
پر شہِ امن کے بندے تھے جو بھولے بھالے — گنبدِ امن میں آرام سے سونے والے
گرم و سردِ زمانہ کے نہ گزرے تھے کبھی — گو دستِ دایۂ راحت کے نہ اترے تھے کبھی
لایا تھا پیچ میں اپنے نہ کبھی غدر انہیں — اور نہ تھی سلطنتِ امن کی کچھ قدر انہیں

اُس کی جانب قدم شوق بڑھائے سب نے
اور ادب سے سرِ تسلیم جھکائے سب نے

یعنی ہم تابعِ فرماں ہیں جدھر جائیے آپ
جان تک دینے کو حاضر ہیں جو فرمائیے آپ

ان میں یہ کوتہیِ فہم جو پائی اُس نے
ملک کے ہاتھ کو دی اور رسائی اُس نے

پہلے نزدیک اشارے سے بلایا اُن کو
جھک کے پھر کان میں یہ نکتہ سنایا اُن کو

کہ شہِ امن سے ہو شہر نہ خالی جب تک
ملک پائیگا تمہارا نہ بحالی جب تک

اور مدد اس میں تمہاری بھی ہے درکار ضرور
چاہیئے میری رفاقت تمہیں اک بار ضرور

سب نے سینوں پہ رکھے ہاتھ کہ ہم حاضر ہیں
اور جہاں آپ قدم ماریئے ہم حاضر ہیں

یہ سخن سنتے ہی اک قہقہہ مارا اُس نے
اور کیا شہر کی جانب کو اشارا اُس نے

دو ڈکر جست کی اور زینت رہوار ہوا
آتشِ فتنہ سے عالم پہ شرر بار ہوا

شہر کی سمت کو رُخ اُس نے دلیرانہ کیا
ایسا للکار کے اک نعرۂ شیرانہ کیا

ہل گئے صدمہ سے جس کے طبقِ خاک تمام
تھرتھرانے لگے نُہ گنبدِ افلاک تمام

یہ بلا شورِ قیامت جو نمودار ہوا
دفعتاً چونک کے میں خواب سے بیدار ہوا

کھل گئی آنکھ تو تھی شامِ سیہ فام وہی
وہی آزاد تھا اور کرسیِ آرام وہی

# مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف

تھا دل آشفتہ جو شب گردشِ ایّام سے میں
ہو کے بے خواب اُٹھا بسترِ آرام سے میں

دل تھا حق تلفیوں سے چرخ کی بیزار مرا
اس کے بیداد سے برہم تھا دلِ زار مرا

جاگتے جاگتے وحشت سے جو گھبرایا میں
اور شبِ تار کی تنہائی سے تنگ آیا میں

جیب میں عقل کی کنجی کو ٹٹولا میں نے
اور کتب خانۂ خیالات کا کھولا میں نے

وہ کتب خانہ کہ جو علم کا گنجینہ تھا ‏ یا کہ رُوداد زمانہ کا اک آئینہ تھا
کتبِ عہدِ قدیم اُس میں سجائی تھیں بہت ‏ عہدِ آیندہ کی تصویریں لگائی تھیں بہت
بہت اوراقِ پریشاں کہ بہم تھے اُن میں ‏ ماضی و حال کے احوال رقم تھے اُن میں
تھے پڑے دفترِ تاریخ کے انبار بہت ‏ اور نسب ناموں کے پھیلے ہوئے طومار بہت
اُنہیں اوراق میں اک مجھ کو نسب نامہ ملا ‏ کہ عجب مخزنِ اسرار پئے خامہ ملا
سر بسر تھے رقم احوالِ نکوفال اُس میں ‏ خاندانِ شہِ انصاف کے تھے حال اُس میں

---

صدقِ روشن گہرِ آفاق میں تھا باپ اُس کا ‏ چہرہ پر باپ سے روشن تھا سو آپ اُس کا
تھا نسب اُسکے بزرگوں کا یقیں سے ملتا ‏ حق و واقع کا بھی رشتہ تھا یہیں سے ملتا
ہر شرف کا غرض اس گھر سے پتا ملتا تھا ‏ رفتہ رفتہ یونہی ایمان سے جا ملتا تھا

---

ماں کی جانب میں دیانت کا تو فرزند تھا وہ ‏ اور امانت کے کلیجے کا جگر بند تھا وہ
دانش و داد نے دُودھ اپنا پلایا تھا اُسے ‏ حُسنِ اعمال نے گودوں میں کھلایا تھا اُسے
اُس نے جب ہوش سنبھالا تو بہت شاد ہوئے ‏ ملکِ دل خورمی و عیش سے آباد ہوئے
بعد ازاں مکتبِ تہذیب میں سب لائے اُسے ‏ تا کہ دنیا کی بھی کچھ عقل ذرا آئے اُسے
یاں ادب نے اُسے شائستہ و دلخواہ کیا ‏ علم نے اُس کو ہر اک راز سے آگاہ کیا
کر چکے علم و ادب جبکہ ادا حق اپنا ‏ اور فضیلت نے کیا نائبِ مطلق اپنا
ملک القدس کے دربار میں تب لائے اُسے ‏ کہ معزز کسی اعزاز سے فرمائے اُسے

---

سرِ دربار بصد حُسنِ ادب آیا وہ ‏ ایسے آداب سے تسلیم بجا لایا وہ
کہ شہِ قدس اُسے دیکھ کے خورسند ہوا ‏ اور ہر اک حاضرِ دربار رضا مند ہوا

دونوں اُستاد و اتالیق تھے ہمراہ آئے | باندھ کر دستِ ادب روبروئے شاہ آئے
کی یہ پھر عرض کہ تو خسروِ نورانی ہے | اور تجھے عالمِ بالا کی جہانبانی ہے
چاند یہ اوجِ حکومت پہ جو چمکا ہے ترے | ملتجی آج فقط مہرِ کرم کا ہے ترے
اے شہِ قدس رہے تیز نظر حال اس کا | ایسا چمکائیو تو نیّرِ اقبال اس کا
کہ فزوں مہر سے ہو جائے درخشانی میں | حکم ہو اس کا رواں کشورِ انسانی میں

---

حال یہ علم و ادب نے جو سب اظہار کئے | اور قیافہ نے بیاں اُس کے سب اطوار کئے
خسروِ قدس نے تب موردِ اعزاز کیا | خلعت و عزّت و عظمت سے سرافراز کیا
اپنے اعزازِ دوامی کا دیا تاج اُس کو | اور دعاؤں سے کیا صاحبِ افواج اُس کو
مشتری نے دیا عزّت کا عمامہ اپنا | اور عطارد نے دیا ہاتھ سے خامہ اپنا
لقبِ خسروِ انصاف اُسے ارشاد کیا | اور روانہ پئے کشور ایجاد کیا
کہ ہوا ملکِ فنا ہے جو خرابات تمام | ستم و جور کی ہے چھائی ہوئی رات تمام
جاکے آفاق کو تم نور سے پُر نور کرو | اور خراباتِ جہاں عدل سے معمور کرو

---

نسخۂ سیرِ خیالی تھا سرِ دست ابھی | اور نظر سلسلۂ شوق سے پابست ابھی
کہ ورق چھوٹ پڑا ہاتھ سے یکبار مرے | نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار مرے
چھائے ایسے یہ تصوّر دلِ بیتاب میں تھے | کہ جو تھے دل میں خیالات وہی خواب میں تھے
اس تصوّر نے غرض میرے اُڑایا مجھ کو | دفعتہً ایسے بیابان میں لایا مجھ کو
وہمِ شاعر کی جہاں بات بھی پہنچے نہ کبھی | وسعتِ فرضِ محالات بھی پہنچے نہ کبھی

یک بیک عدل کے آثار نمودار ہوئے | اور تمام ارض و سما مطلعِ انوار ہوئے

بقعۂ نور کا اک تخت ہوا اور اُترا — کہ جہانداریٔ عالم کو جہاندار اُترا
تھا جلال اُسکے یہ چہرے کی درخشانی میں — چلی جاتی تھی نگہ دیدۂ حیرانی میں
تاب جب تابشِ انصاف کی پائی نہ کہیں — اور ہوئی اُس کی تجلّی کی سمائی نہ کہیں
پردۂ ابرِ کرم سامنے ڈالے اُس نے — مگر اِس پردہ میں وہ رنگ نکالے اُس نے
کہ اک آرام سا آنے لگا بینائی کو — اور ترقی ہوئی ہر دل کی توانائی کو
عالمِ قدس کے سب پاک نہاد آئے وہاں — بند و بست اُنکو جو درکار تھے فرمائے وہاں
جب کہ ساماں ہوئے سب بزمِ شہنشاہی کے — اور ہوئے نظم و نسق ماہ سے تا ماہی کے
توشۂ عدل ہوا جلوہ نمائے عالم — معتدل ہوگئی پھر پھر کے ہوائے عالم
ضعف و قوت چڑھے اندازے سے یکساں آگئے — اور کھڑی ہوگئی انصاف کی میزاں آگے
رات دن کو یہ ہوا حکم کہ تُل جائیں ابھی — نیک و بد جو ہوں زمانہ میں دکھا جائیں ابھی
یاس و امید کھڑے سامنے مُنہ تکتے تھے — رعب سے شاہ کے پر بات نہ کر سکتے تھے
لی تھی ماں باپ کے وصفوں سے جو تاثیر اُس نے — اور پیا دایۂ دانش کا بھی تھا شیر اُس نے
چہرہ پُر رعبِ خداداد برستا تھا پڑا — حُسنِ خُلق اُس کا مگر پھول سا ہنستا تھا پڑا
تھا لئے ہاتھ میں اک تیغ شرربار عجیب — اس کے جوہر کا مگر تھا یہ کچھ اسرار عجیب
کاٹ میں بال کا چھوڑے نہ کم و بیش ذرا — اور نہ ہو تول میں تل بھر کا کم و بیش ذرا
دوسرے ہاتھ میں فانوس فروزاں تھا لئے — یا پئے جور و ستم آتشِ سوزاں تھا لئے
گرچہ فانوس میں تھی اُسکے ہر اک بات نئی — نور فانوس میں پر تھی یہ کرامات نئی
یعنی اصلیّتِ اشیا کو دکھا دیتا تھا — نیک و بد صورتِ آئینہ بتا دیتا تھا

---

الغرض خسروِ انصاف کا دربار کھلا — دل پہ عالم کے درِ دولتِ بیدار کھلا
حق و اثبات چپ و راست وزیر اُسکے ہوئے — ذہن و ادراک و قیاس آکے مشیر اُسکے ہوئے

مصلحت باندھے ہوئے عہد وفا تھی اُن سے ہوتی تدبیر نہ اک آن جُدا تھی اُن سے
پھر اک سمت کو جوں شعلہ بھڑک جاتا تھا رحم پر آپ کرم آکے چھڑک جاتا تھا
یُمن و اقبال سے چمکایا وقارِ دربار اور ہوا عظمت و شوکت پہ مدارِ دربار

---

کرچکے نظم و نسق آکے جو سب تیاری تو ہوا پہلے یہ دربار سے فرماں جاری
کہ جو مظلوم ستمدیدہ بیچارے ہوویں اور وہ حق تلفیوں سے ظلم کے مارے ہوویں
بر سرِ دادیٔ انصاف ابھی لائیں انہیں تاکہ تحقیق سے ہم داد کو پہنچائیں انہیں

---

شہِ انصاف کو یہ بات جو منظور ہوئی اشتہاروں کی زباں سے وہیں منظور ہوئی
کی پر اُس حکم نے دُنیا تہ و بالا گویا بلکہ گھر گھر عجب اک تہلکہ ڈالا گویا
یاس اور آس کے اور شادی و ناشادی کے تھے جو خوف و خطر آبادی و بربادی کے
تو جسے دیکھتی تھی اُس کو لگی تھی اپنی پڑ گئی تھی غرض اک ایک کو اپنی اپنی
تھے جو حق تلفیوں سے لوگ دل افگار تمام اُن کی آن میں مظلوم و ستمگار تمام
ہوگئے اِس طرح فراہم سرِ میدانِ جہاں ہوگیا حشر کا میدان بیابانِ جہاں

---

دوسرا حکم ہوا اور وہاں سے جاری اور ہوا خلق میں شہرت کی زباں سے جاری
کہ جُدا ہوویں ہر اک فرقہ کے اشخاص الگ تاکہ احکام میں بھی عام سے ہوں خاص الگ

---

جب کہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا تو کئی بار ستم دستِ اجل میں آیا
پہلے اک فرقہ طلب بر سرِ دربار ہوا حکم دربار سے اس طرح اظہار ہوا
کہ جو قبضہ میں ہو حقیت و املاک کوئی نقد یا جنس جہاں ہو تو افلاک کوئی

اُس پہ دعویٰ ہے جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی — اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی
حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوئے دربار بہت — کھلے اسنادِ فرامین کے طومار بہت
آل تمغا تھے پہ طغرائے سلاطینِ سلف — اور مطلّے و مزیّن تھے بہ آئینِ سلف
بہت اسناد و وثائق کے قبالے آئے — سیکڑوں مہرِ شہادت کے حوالے آئے
پر نظر جب شہِ انصاف نے ڈالی اپنی — اور وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی
پھر شہادت کوئی پوچھی نہ گواہی دیکھی — اور نہ مہر و توزک و دفترِ شاہی دیکھی
جو جو اسناد کہ در پیشیٔ انصاف میں تھے — تھے کھلے یا کہ دھرے گوشہ و اطراف میں تھے
انقلابوں نے زمانہ کے چھپایا تھا انہیں — یا کہیں خوفِ جرائم نے دبایا تھا انہیں
تھے وہیں زیرِ بغل یا کہ مکانوں میں چھپے — اور مکانوں میں بھی صندوقوں کے خانوں میں تھے
روشنی پڑتے ہی احوال عیاں ہو گئے سب — جعل کے حرف جہاں تھے وہ دھواں ہو گئے سب
جعلسازوں نے یہ جب دیکھا تو گھبرائے بہم — مکر و تزویر کے پرچے وہیں دوڑائے بہم
آئی دولت بھی مگر اس کی رسائی نہ ہوئی — اور سفارش سے وہاں کارروائی نہ ہوئی
طرفہ تر لطف یہ لیکن سرِ دربار ہوئے — کہ یکایک بدل اقبال سے ادبار ہوئے
بے نوا آئے تھے جو وہ امرا ہو گئے سب — جو امیر الامرا تھے وہ گدا ہو گئے سب

---

الغرض حق کو پہنچ کر جو یہ حقدار آئے — تو وہ انصاف طلب بر سرِ دربار آئے
کہ خطابوں نے بنایا تھا سرِ اعزاز انہیں — دینی القاب تھی سرمایۂ اعزاز انہیں
ان میں وہ لوگ کہ جو صاحبِ دستار بھی تھے — تن پہ چمکاتے ہوئے خلعتِ زرتار بھی تھے
خاندانوں کی بزرگی نے بڑھایا تھا انہیں — یا کہ دولت کی ہواؤں نے اُڑایا تھا انہیں
سب سے پہلے وہ قدم مار کے آئے آگے — عَلَمِ فخر جو لائے تھے بڑھائے آگے
پر جب انصاف نے فانوس اُٹھائی اپنی — چاندنی پرتوِ انصاف نے چھائی اپنی

تو وہ گمنام جو عالم میں سدا خوار رہے — اور کیئے کارنمایاں تو وہ بیکار رہے
اب وہ رُخ پہ تو اعزاز سے چمکانے لگے — اُن کے سر پر علم اقبال کے لہرانے لگے
پر جو دربار میں آئے تھے سرافرازی سے — اب بھی باز آئے نہ ظالم وہ فسوں سازی سے
لائے تدبیر کو مطلب کی گزارش کے لئے — چٹھیاں لائے بہت اپنی سفارش کے لئے
حق کے آگے نہ مگر پیش کوئی بات گئی — اُن کی جو بات تھی آخر وہ خرافات گئی
اُن کے بعد اور اک انبوہ نمودار ہوا — پر عجب شان سے وہ واردِ دربار ہوا
تھے بہت زیرِ کُلہ نخوتِ شدّاد لئے — اور بہت زیرِ بغل خنجرِ بیداد لئے
سینہ زوری نے اُنہیں سینوں میں تھے زور دئے — شورپشتی نے اُنہیں تھے سرِ پُرشور دئے
سیکڑوں بادۂ دولت کے تھے مخمور اُن میں — اور بہت زورِ حکومت سے تھے مغرور اُن میں
بادشاہوں کے بھی دربار میں تھی راہ اُنہیں — اور ہوا خواہ سمجھتا تھا ہر اک شاہ اُنہیں
ظلم گردوں کی طرح چھائی تھی بیداد اُنکی — کسی دربار میں سُنتے نہ تھے فریاد اُن کی
اُن کے مظلوم کہ تھے ظلم کے مارے سارے — عدل کی آس پہ بیٹھے تھے بچارے سارے
جو ستم اُنپہ ہوئے تھے وہ جتا سکتے نہ تھے — لب تلک نالۂ پُر درد کو لا سکتے نہ تھے

پر جو تھا خسروِ انصاف کا دربار یہاں — اور نہ تھا دور رعایت سے سروکار یہاں
باتو ہر معرکہ میں تھے وہ ستمگار آگے — یاں مگر ہو گئے مظلوم دل افگار آگے
روشنی پڑتے ہی آئینہ ہوئے حال اُنکے — خود بخود کھل گئے سب دفترِ اعمال اُنکے
دستِ ظلم اپنے ستمگار اُٹھا بھی نہ سکے — بلکہ جو ظلم کیئے تھے وہ چھپا بھی نہ سکے
قہر سے کی جو شہِ عدل نے یک بار نگاہ — ہوئی اس طرح سے اُن سب پہ شرربار نگاہ
کہ جو تھے شیر کی کھالوں میں اکڑتے آئے — اور ہوا سے دمِ رفتار جھگڑتے آئے
جامے جل جل کے وہ سب اُنکے سرِ خاک گرے — اور غلافوں سے نکل کر جو وہ بیباک ہوئے
رعب سے خسروِ انصاف کے تھرانے لگے — سب کے سب صورتِ روباہ نظر آنے لگے

شہِ انصاف سے اُس دم یہ صدا دی سب کو
اور منادی نے وہیں آکے ندا دی سب کو
کہ جو زیراں سے تھے ابتک وہ دلیر اُنپہ رہیں
اور مسلّط وہ سدا صورتِ شیر اُن پہ رہیں

---

لوگ کچھ زمرۂ اعزاز میں واں اور آئے
پر جو دیکھا تو نظر اُن کے عجب طور آئے
علماؑ و فضلاؑ و بلغا تھے سارے
اور بھرے سر میں فضیلت کی تھے ہوا سارے
تھے بہت جبّہ و عمّامہ شالی رکھتے
اور بظاہر تھے مثالے کی بحالی رکھتے
روٹیاں مسجدوں میں کھاتے تھے و نذرات پڑے
مفت خوری میں بسر کرتے تھے اوقات پڑے
سر پہ دستارِ مشیخت کی بہت بھاری تھی
اور شکم خالی کتابوں کی اک الماری تھی
تھے مگر ایسے بھی اُن میں زدہ احوال بہت
کہ لگدکوب مشقّت سے تھے پامال بہت
شمع ساں آتشِ تصنیف میں گھُلتے تھے سدا
پھٹے کاغذ کی طرح خاک میں رُلتے تھے سدا
تھے پڑے بند قلمدان میں ناکامی سے
اور نکلتے تو ہدف ہوتے تھے بدنامی کے
پر جو نامنصفیِ دہر نے مارا تھا اُنہیں
سخت دشوار زمانہ میں گذارہ تھا اُنہیں
غرض انصاف نے جب پرتو ڈالا اپنا
رنگ تب معنیِ اصلی نے نکالا اپنا
مل گئے خاک میں اعزازِ خیالی سب کے
جل گئے خلعتِ زربفت و شالی سب کے

---

زمرۂ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے
زہد و تقویٰ و ارادت سے با خلاص آئے
بسکہ وابستۂ طاعات و عبادات تھے وہ
خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ
فقر نے مکر کی تصویر بنایا تھا اُنہیں
خرقہ پوشی نے مرقّع میں سجایا تھا اُنہیں
دیتے جاروب سرِ خاک سے تھے جامے اُنکے
چھتریاں سر پہ لگاتے تھے عمامے اُن کے
سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے
عرضِ حال اپنے وظیفوں میں سناتے آئے
کیا پیری نے نکھارا روشن رخِ نورانی کو
اور نشانِ سجدہ نے چمکاتے تھے پیشانی کو

پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں اُنہیں — تا بدربار بھی سو عذر تھے آنے میں اُنہیں
تھے مگر اس پہ بھی اک ایک سے آگے جاتے — اور یہ کہتے سوے دربار تھے بھاگے جاتے
کہ زمانے کا کوئی لطف نہ پایا ہم نے — اور کچھ آرام نہ دنیا کا اُٹھایا ہم نے
آئے دنیا کے نہ افسون فسانہ میں کبھی — اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانے میں کبھی
آج سجادہ نشینی کا ہو اعزاز ہمیں — کیجئے تاج کرامت سے سرافراز ہمیں
جب کرامات یہ اک اک نے سنائی اپنی — شہِ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی
معرفت شمع فروزاں سے یک بار آئی — کرتی اصلیتِ اشیا کو نمودار آئی
مکر و تزویر ہوئے اُڑ کے ہوائی سارے — کھل گئے زہد خدائی و ریائی سارے
جو یہ کہتے تھے کہ دنیا سے ہمیں کام نہیں — بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سنا نام نہیں
یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے — اُن کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں — نان و نفقہ کی طلبگار بچاری دوڑیں
بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا — پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا
علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے آنا چاہا — بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا
سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے — خونِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ اپنے
قتلِ مضموں تھا زمانہ میں فقط کام اُن کا — نکتہ چینی سے تھا مشہورِ جہاں نام اُن کا
گرچہ شورش سے قدم آگے بڑھائے ہوئے تھے — رُوسیاہی میں وہ منہ کو چھپائے ہوئے تھے
الغرض بڑھ کے وہ جب حرم سرِ دربار آئے — لوگ اُنہیں دیکھتے ہی جوش میں یک بار آئے
اور یہ چلائے کہ ہے علم سے کیا کام انہیں — مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام انہیں
کوئی تصنیف ہو ان کی تو دکھا دیویں ذرا — ہو جو تقریر کا دعوےٰ تو سنا دیویں ذرا
سُن کے اس بات کو اُن کے بھی ہوئے کان کھڑے — سامنے تخت کے گھبرا کے ہوئے آن کھڑے
سوچ کر ہوش و حواس اپنے سنبھالے آخر — تھے بغل میں کئی کاغذ وہ نکالے آخر

اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم ۔۔۔ پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم مانتے ہم
یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں ۔۔۔ اِس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں
ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں ۔۔۔ کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں
سُن کے اِس بات کو اک قہقہہ مارا سب نے ۔۔۔ اور کیا کاغذوں پہ کر کے اشارہ سب نے
کیا خرافات اُٹھا لائے ہو لے جاؤ اُنہیں ۔۔۔ اور کبھی بر سرِ دربار نہ پھر لاؤ اُنہیں

---

لوگ اتنے میں با انبوہ کثیر آئے بہت ۔۔۔ اہلِ دربار اُنہیں دیکھ کے گھبرائے بہت
تھے کچھ آپس میں وہ کرتے ہوئے تکرار آتے ۔۔۔ غُل مچاتے ہوئے سب تھے سوئے دربار آتے
اہل سیف اہل قلم شاملِ حال اُن میں تھے ۔۔۔ اور بہت تجربہ کار اہل کمال اُن میں تھے
اُن کا غُل جبکہ بہت حد سے زیادہ پہنچا ۔۔۔ شہ کا تب حکم یہ اک لے کے پیادہ پہنچا
کہ ادب شاہ کا اتنا نہ فراموش کرو ۔۔۔ کیوں ہیں غُل اتنا مچاتے انہیں خاموش کرو
اہلِ سیف آگے بڑھے تیغ زباں تولے ہوئے ۔۔۔ پیشقدمی کے دلائل سے عَلم کھولے ہوئے
ساتھ ہی اہلِ قلم بولے یہ امکان نہیں ۔۔۔ اور یہ آئینِ ادب میں کبھی شایان نہیں
جاہلیت کی حمیت کو نہ یہاں لاؤ تم ۔۔۔ علم سے جہل جو بڑھ جائے تو بڑھ جاؤ تم
صاحبِ تجربہ پر اُن میں جو شامل تھے بہت ۔۔۔ اور وہ تدبیر مہمات میں کامل تھے بہت
بیچ میں آن کے چلّائے کہ جانے دو نہیں ۔۔۔ گر قدم تم سے بڑھاتے ہیں بڑھانے دو نہیں
کہ یہی سر بھی ہیں میداں میں کٹانے والے ۔۔۔ ملک کے نام کو سر دے کے بڑھانے والے
کیا ہوا ان سے تمہارے جو قدم پیچھے ہیں ۔۔۔ سوئے دربار تم آگے چلو ہم پیچھے ہیں

---

حکم پھر خسروِ انصاف نے اک اور دیا ۔۔۔ اشتہاروں نے وہیں آ کے اُسے دور دیا
یعنی جو لوگ کہ خواہانِ مناصب ہوویں ۔۔۔ اور لیاقت سے مناصب کے مناسب ہوویں

سامنے خسروِ انصاف کے سب آئیں ابھی — اور جو اسناد لیاقت ہوں وہ دکھلائیں ابھی
حکم دربار یہ سُن کر بہت اشخاص چلے — کچھ بصد ناز چلے کچھ بصد اخلاص چلے
اُن میں وہ لوگ کہ تھے دعوئے اعزاز جنہیں — قدوقامت کی وجاہت سے بھی تھے ناز جنہیں
خلعتِ کہنہ بزرگوں کی سجاتے آتے — اور خطاب اُن کی کتابوں سے سُناتے آئے
پر وہ دربار میں جب آئے عدالت کے لئے — اور بڑھے لاف و گزاف اُن کی وکالت کے لئے
تو شہِ عدل نے فانوس کو جھٹکا یا ذرا — نورِ تحقیق سے بھی پرتو دکھلایا ذرا
کُھل گئی اُن کی حقیقت تو وہ گھبرا کے ہٹے — اور جو تھے آگے بڑھے پیچھے کو شرما کے ہٹے
خسروِ عدل نے تب غور سے سب کو دیکھا — پہلے اک اک کے حسب اور نسب کو دیکھا
جس قدر اہلِ شرافت نظر آئے اُن میں — اور پھر اوصاف لیاقت کے بھی پائے اُن میں
پاس بلوا کے بہت موردِ اعزاز کیا — اور اُنہیں منصبِ عالی پہ سرافراز کیا
پر اک انبوہ کثیر اُن میں جو ناکام ہوا — کام کا اُس کے بہ مقصد یہ سرانجام ہوا
شور و فریاد سے کرنے لگا آفت برپا — کیا دربار میں اک شورِ قیامت برپا
ایسے چلّائے کہ میں چونک کے بیدار ہوا — لیکن اس بات سے خوش میرا دلِ زار ہوا
کہ لیاقت سے جو تھے منتخب اشخاص ہوئے — میرے احباب اُن اشخاص میں تھے خاص ہوئے

سامنے چیخنے تھے دشمنِ بدکیش مرے
رہے ناکام سب اعدائے بداندیش مرے

# مثنوی موسوم بہ وداعِ انصاف

جب طورِ دمِ صبح شبِ تار کا بدلا — اور رنگ چمن میں گُل و گلزار کا بدلا
شبنم نے گُہر فرش کئے خاک کے اوپر — اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر

چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے　　اور چاند پہ جانوں کو لگے مارنے سارے
آئی جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں　　انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں
لی صبح کے پہلو پہ اُدھر رات نے کروٹ　　لی خاک پہ یاں مستِ خرابات نے کروٹ
زاہد جو الٰہی کی طرح جھوم رہا تھا　　اور بیٹھا مصلّے پہ زمیں چوم رہا تھا
بیدار ہوا سُن کے مؤذن کی اذاں کو　　آزاد جو تھا صرفِ سخن کر رہا جاں کو
ہشیار ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے　　اور وقتِ سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے
تا فیضِ سحر سے ہو دلِ زار شگفتہ　　اور ہو کوئی دم جانِ پُر آزار شگفتہ
پر طائرِ دل جب قفسِ شہر سے نکلا　　اور قلزمِ افکار کی بیں لہر سے نکلا
دیکھا کہ سوئے دشت ہے دنیا چلی جاتی　　اور خلق ہے دوڑی سوئے صحرا چلی جاتی
حیرت ہوئی میرے دلِ بے تاب و تواں کو　　اور پوچھا ہر اک شخص سے اِس رازِ نہاں کو
پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نہ کسی نے　　اِس پردۂ حیرت کو اُٹھایا نہ کسی نے
آخر کو نظر عقلِ نظر باز سے لے کر　　اور شوق کے بازو پہ پرِ پرواز سے لے کر
پابند برفتارِ زمانہ ہوا میں بھی　　ساتھ اُن کے سوئے دشت روانہ ہوا میں بھی
جب شہر کے میدان سے ہم دُور تر آئے　　اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے
دیکھا کہ سرِ راہ کچھ اشجار ہرے ہیں　　دامانِ تمنا کو طراوت سے بھرے ہیں
اک شاہ اُسی جا بہ سرِ خاک ہے بیٹھا　　بیٹھا ہے مگر سخت غضبناک ہے بیٹھا
اور سامنے باندھے ہوئے ہاتھ کھڑے ہیں　　کچھ برہنہ سر اور کہ جو ساتھ کھڑے ہیں
وہ آگے گرے پاؤں پہ بادیدۂ تر ہیں　　اور عفوِ جرائم کو جھکائے ہوئے سر ہیں

---

پر شاہ نے تلوار کو کھولا ہے کمر سے　　اور افسرِ شاہی کو بڑھا ڈالا ہے سر سے
دیکھی جو یہ رُوداد تو حیران ہوا میں　　جب حد سے سوا دل میں پریشان ہوا میں

اک ایک سے پوچھا کہ ہوا واقعہ کیا ہے　　اور شہر میں کیا چل گئی وحشت کی ہوا ہے
وہ ہو رہے ہیں سب مضطر و ناچار تھے ایسے　　اور اپنی مصیبت میں گرفتار تھے ایسے
آتی تھی کسی میں نہ نظر بات کی حالت　　تھی بات کی حالت نہ اشارات کی حالت

---

اک پیرِ کہن اتنے میں نزدیک تر آئے　　اور ہوش بھی کچھ اُن کے ٹھکانے نظر آئے
یہ عقدۂ سربستہ رکھا سامنے اُن کے　　کھولا یہ معمّا لبِ ناکام نے اُن کے
یعنی کہ سہے یہ شاہ شہنشاہِ مروّت　　تھی اس سے زمانہ میں رواں راہِ مروّت
اب اُس نے جو دیکھا کہ ہے رنگ اور یہاں کا　　ایمان ٹھکانے نہ رہا اہلِ جہاں کا
دنیا میں رہے بگڑی ہوئی ایک ایک کی نیّت　　اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیّت
اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا　　اور سلطنت خلق سے مُنہ موڑ کے اپنا
ہے چھوڑتا سب مملکت و مال کو اُن کے　　تا اُن کی سزا سونپ کے اعمال کو اُن کے
خود گوشۂ عزلت میں گزارہ کرے اپنا　　سر خاک پہ اک اک یہاں مارا کرے اپنا

---

اتنے میں جو تھے لوگ پس و پیش پریشاں　　تھے نیک و بد اُن میں بدلِ خویش پریشاں
سب مل کے فراہم ہوئے اور متّصل آئے　　ہر چند کہ تھے دل میں بہت منفعل آئے
لیکن تھا ہجوم ایسا بہ کثرت نظر آتا　　تھا دل میں تصوّر یہ مرے بیشتر آتا
یارب یہ زمیں سے ہیں کہ افلاک سے آئے　　یا مُردہ نکل کر ہیں تہِ خاک سے آئے

---

اُس بھیڑ میں آشوب سا اک دفعتاً آیا　　یا پانی کا ریلا کہ جو تھا موج زن آیا
جو راس و چپ اُن میں تھے چپ و راس ہو گئے سب　　میں جن میں کھڑا دور تھا وہ پاس ہوئے سب
پہنچا تھا میں اب فاصلہ پر حدِ نظر کے　　کی جب کہ نظر شوق کے شانوں پہ اُبھر کے

دیکھا ہو اُستاد سے ہے سلطانِ مروّت
کرتا ہے عیاں حالِ پریشانِ مروّت

اب کھولتا ہے تیغ کو ہمّت کی کمر سے
اور ہاتھ میں ہے افسرِ شاہی لیا سر سے

گو چشمِ غضبناک سے ہے قہر ٹپکتا
پر لب سے غم و یاس کا ہے زہر ٹپکتا

اور کہتا ہے وہ بادشہِ معدلت اندیش
اک آہ سے کہ اے فرقۂ ناعاقبت اندیش

بھیجا ملک القدس نے تھا مجھ کو جہاں میں
تا خلقِ خدا جو ہو زمیں میں کہ زماں میں

ہو ویں وہی اُن کا جو ہے دینِ مروّت
اور نظم و نسق ہو وے بہ آئینِ مروّت

آپس کی رفاقت سے چلیں کام سبھوں کے
نیکی سے ہوں مشہور جہاں نام سبھوں کے

پیدا جو خدا نے ہے کیا کون و مکاں کو
اور عالمِ اسباب بنایا ہے جہاں کو

کام ایک پہ ہے ایک یہ یاں منحصر ایسا
اور اُن میں بہم سلسلہ باندھا ہے پھر ایسا

جس سلسلہ بندی کی جدائی نہ ہو ممکن
اور ہو سکے جُد اکا رروائی نہ ہو ممکن

رل مل کے زمانہ میں گزارے ہوں سبھوں کے
آپس کی مروّت پہ سہارے ہوں سبھوں کے

اور سب کو سہارا ہو خدا و ندِ جہاں کا
اُس بن ہو گزارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

---

پریاں تو ہیں سب بادۂ نخوت پیئے بیٹھے
دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لئے بیٹھے

گزری ہوئی گردوں سے ہے گردنکشی اُنکی
اور اُس پہ وہ خود رائی و خود مطلبی اُنکی

نیکی پہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو
اور دیکھ نہیں سکتے زمانہ میں کسی کو

افسوس کہ رتبہ مرا جانا نہ کسی نے
اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے

لیکن جو زمانہ میں یہی کام ہیں اُن کے
خود دیکھینگے اک دن جو کچھ انجام ہیں اُنکے

ہر چند ہیں آج اہلِ زمانہ مرے دشمن
اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن

پر ہوتے وہ ان کو جو ہیں سب برہبر کیں یہ
جائینگے کہاں بچ کے یہیں ہیں یہ ہوں ہمیں یہ

یہ سُن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا — اور راستے میں اک طرفہ تماشا نظر آیا
دو شخص سرِ معرکہ واں دفعتہً آئے — اور شاہ کے پہلو میں بدرد و محن آئے
سر اپنے جھکائے ہوئے غمناک تھے دونو — اور روتے سے بادیدۂ غمناک تھے دونو
وہ دونو کی وزارت تھی بدربارِ مروت — اور چلتا انہیں دونو سے تھا کارِ مروت

---

اک اُن میں کہ تھا برف نے ڈھالا بدن اُسکا — تھا اُس کا بڑھاپا سندی پیرہن اُس کا
وہ خلقِ خدا میں تھا جو غمخوار سبھی کا — اور آنکھ سے دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا
جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا — اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گُھلا جاتا تھا گویا
وہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اُس کا — تمغائے وزارت پہ رقم نام تھا اُس کا

---

اک دوسرا شخص اور جو ہمراہ تھا اُس کے — چہرہ پہ برستا حشم و جاہ تھا اُس کے
وہ نسخۂ حیرت بہ نگاہِ عقلا تھا — اور تن پہ جو کی غور تو کندن سے ڈھلا تھا
کچھ توڑے زرِ نقد کے تھے ہاتھ میں اُس کے — صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُسکے
پر ہاتھ میں توڑے جو پُراز دام و درم تھے — خالی تھے بہت اُن میں بھرے رہ گئے کم تھے
عالم میں سخاوت سے کرم اُس کا لقب تھا — اور بارِ وزارت وہ اُٹھائے ہوئے سب تھا
دنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے اُس کے — سمجھا یہ مناسب دلِ آگاہ نے اُس کے
میرے عملِ خیر کی یاں قدر نہیں ہے — اور دو بخیلوں کا تو چرخِ بریں ہے
ہیں بسکہ بداندیش پئے خلقِ خدا یہ — دنیا تو جہنم میں گئی دیویں گے کیا یہ
دل سینۂ گندم سے بھی ہے تنگ تر اِن کا — دیتے کو جو دیکھیں تو ہے پھٹتا جگر اُن کا
اب یاں سے چلا شاہ خوش اقبال ہے اپنا — جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا
دونو وہ غرض باندھ کے دستِ ادب آئے — اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیرِ لب آئے

بے شبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے  یہ ملکِ فنا قابلِ آرام نہیں ہے
افسون و فسانہ پہ یہ دل دادہ ہیں سارے  اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سارے
حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے  اب یہ رہیں گمراہ یہی اُن کی سزا ہے
پر شاہ سے یہ عرض نمک خوار ہیں کرتے  اور مصلحتِ وقت کو اظہار ہیں کرتے
گو اہلِ جہاں پھیرے ہیں رخ راہِ وفا سے  اور باندھے ہیں پیمانِ وفا مکر و دغا سے
پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں  اور جوہرِ اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں
سلطانِ مروّت کو ہیں جو شاہ سمجھتے  اور شاہ کو ہیں سایۂ اللہ سمجھتے
وہ وضع زمانے کی خوش آئی نہیں اُن کو  ان قدموں سے منظور جدائی نہیں اُن کو
باقی نہیں دُنیا کی ہوس کوئی رہی ہے  اب اُن کو تمنا جو رہی ہے تو یہی ہے
ہم یعنی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں  اور بندۂ حق وہ ہے جو ہے بندۂ احساں
جو جو کہ شرف پائے ہیں اس فیض کرم سے  لیکن اُن کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے
اک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے  اور جوش جو ہیں جاں ہوا خواہ کے اپنے
وہ رنگ میں شکریہ کے اُس آن نکالیں  اور سینوں میں جو کچھ ہیں وہ ارمان نکالیں

---

جب لب پہ یہ اُن کے سخن پُر اثر آئے  اُس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے
گزرے دلِ غمگیں پہ خیالات ہزاروں  اور پیشِ نظر پھر گئے حالات ہزاروں
کچھ دیر تامّل کے مگر اُن سے کہا یہ  اُن کی جو تمنا ہے تو پھر بات ہے کیا یہ
گو روکتا میرا دلِ مجبور ہے مجھ کو  پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھ کو
دی جبکہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے  شہرت کی منادی سے وہیں سُن لیا سب نے
باہمتِ مروّت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں  اور جلوہ نما جوہرِ اخلاص تھے اُن میں
ہر سمت سے وہ فرقہ بفرقہ اِدھر آئے  اور شاہ کے شکریے کو باچشمِ تر آئے

اک فرقہ کا احوال نظر طرفہ تر آیا
دولت تھی زر و سیم لٹاتی ہوئی آ گئے
شہرت کی دوامی سے کئے نام تھے روشن
امیدیں خلائق کی جو تھیں ان کی طرف تھیں
تھے اہل جہاں گرد امنڈ آئے ہزاروں
تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ
تھے نور بقا شمع جلائے ہوئے آگے
پوشاک سے ملبوس سے اور طرز سخن سے
ہیں ان میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا
وہ فرقہ مگر جب مرے نزدیک تر آیا
سمجھا کہ سخاوت کے یہ پروردہ ہیں سارے

وہ سب سے مقدم تھا قدم مار کر آیا
اور دور سے تھی نور اڑاتی ہوئی آ گئے
آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن
اور آنکھیں زمانے کی لگیں ان کی طرف تھیں
اور امن امید کے پھیلائے ہزاروں
اور دن سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ
ہاتھوں کے وہ سب کے تھے آئے ہوئے آگے
تھے مختلف الوضع جو وہ اصل و وطن سے
اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہچان نہ سکتا
اور ان میں سبھی حاتم طائی نظر آیا
اور چشم مروت کے نظر کردہ ہیں سارے

---

بعد ان کے جو اشخاص کہ آتے نظر آئے
تھے دولت و اقبال جلو میں لئے آتے
تھے چتر شہی ہو رہے قربان سروں پر
پر دخل نہ واں تک تھا ذرا تاج زری کا
لہرا رہے ایک ایک کے سر پر جو علم تھے
تھے ان پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے
تھے نور سے تمکین دو تا ان پہ برستے
یکساں تھے بحیثیت اقبال وہ سارے

وہ شان و شکوہ اور دکھاتے نظر آئے
اور سر پہ ہما ان کے تھے سایہ کئے آتے
اور تاج فدا کر رہے تھے جان سروں پر
افسر تھا سر فرق و مرا ناموری کا
اعزاز دوامی کے نشاں ان پہ رقم تھے
تا حشر رہیں گے سحر و شام چمکتے
اور پھولوں سے تھے رنگ بہار ان پہ برستے
پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے

کچھ رازِ نہاں دل پہ ہوا جس کا عیاں تھا کہ اُس کے لقب اُن میں شہِ نوشیبہ رواں تھا
میں سمجھا کہ ایسے جو بہ تسکین ہیں آتے
تسلیم عدالت کے سلاطین ہیں آتے

# مثنوی موسوم بہ گنجِ قناعت

مصروف تھا میں سیر میں شب عالمِ جاں کی اور زیرِ نظر راہ تھی اسرارِ نہاں کی
ہر چند تھا جوں نقشِ قدم خاک کے اوپر پر خاک پہ تھا میں گہے افلاک کے اوپر
ہر دم مجھے گھر بیٹھے زمانے کا سفر تھا اور پائے تصور سے ہر اک دل میں گزر تھا
کھولے ہوئے دروازہ ہر اک سینہ تھا آگے جو سینہ تھا گویا کہ اک آئینہ تھا آگے
سینہ میں کبھی جاں میں کبھی اور کبھی دل میں اور دل سے پہنچتا تھا کبھی آنکھ کے تل میں
روشن صفتِ آئینہ حالات تھے اُن کے اور جوہرِ آئینہ خیالات تھے اُن کے
ہر منعم دہر و مفلس و ہر شاہ کو دیکھا ہر مے کش و صوفیِ حق آگاہ کو دیکھا
ہر چند کہ رفتار بہ سیرِ سفری تھی آنکھوں پہ مگر عقل کی عینک جو دھری تھی
ہر دل میں نظر آتے تھے ارمان ہزاروں اور اُن میں خیالات پریشان ہزاروں

---

القصہ ہر اک خانۂ و کاشانہ میں ہو کر یعنی کہ ہر اک دل کے نہاں خانہ میں ہو کر
جب پائے نظر میں نے رکھا پیشتر اپنا اک ایسے دلِ پاک میں پایا گزر اپنا
ہر چند کہ تھا تنگ رہ او ضائع جہاں سے وسعت میں تھا کم دیدۂ کوتہ نظراں سے
پر گوشہ میں بیٹھا تھا لیئے کون و مکاں کو اور آنکھوں میں طے کرتا تھا میدانِ جہاں کو

دیکھا کہ ہے آراستہ اک انجمن اُس جا — اور جلوۂ انوار ہیں پرتو فگن اُس جا
ہر چند کہ دربار تو شاہانہ نہیں تھا — اُس دَور میں جمشید کا پیمانہ نہیں تھا
پر تھا عجب اک نور کا جلوہ کہ نہ پوچھو — اور اُس کا دلوں پر وہ اثر تھا کہ نہ پوچھو

---

وہ گھر کہ جو سرمایۂ آسودہ دلی تھا — اور کعبۂ دل خلق میں گر تھا تو وہی تھا
واں ڈر کی جگہ دل میں ادب ہوتے تھے پیدا — جو رعب کے ثمرے تھے وہ سب ہوتے تھے پیدا

---

اک مردِ مقدس جو وہاں صدر نشیں تھا — اور کعبۂ عظمت کے مکاں کا وہ مکیں تھا
عالم میں زن و مرد سے لے پیر و جواں تک — آئے کہ نہ آئے کوئی اُس بزم سے واں تک
تھا صدق سے ہر شخص کے دل میں ادب اُسکا — اور خلق میں تھا خواجہ قناعت لقب اُس کا

---

حاضر تھی جو خدمت میں جماعت ندما کی — ہوتی نہ ریاضت کبھی پہلو سے جُدا تھی
اخلاق تھے یارانِ قدیمی میں ہمیشہ — اور صبر و توکّل تھے ندیمی میں ہمیشہ
ہر چند کہ اک گوشہ میں سجّادہ گزیں تھا — پر مسندِ عزّت کے لئے صدر نشیں تھا

---

تھا تاج زری سر پہ نہ سرمایۂ شوکت — اور زیرِ قدم تخت نہ تھا پایۂ شوکت
پر کہتی تھی دولت کہ یہ ہمّت کا وہ غنی ہے — صورت یہی کہتی تھی کہ معنوں کا غنی ہے
تھی اُس کے سراپا سے عیاں شانِ قناعت — اور پاؤں پسیٹے تھے بداماںِ قناعت

---

تھا بسکہ زمانہ سے سروکار نہ اُس کو — دُنیا کی ہوس تھی کوئی زنہار نہ اُس کو
نیّت تھی نہ جاتی کبھی مضمونِ طلب تک — اور تھی نہ ہوس دل میں جو آتی کبھی لب تک

تھی چشمِ تمنا نہ کسی چیز پہ اُس کی　　آنکھوں سے اُبھرتی تھی نہ باہر نظر اُس کی

---

وہ شمع صفت گرچہ سرِ بزم تھا بیٹھا　　اور عزم ہدایت پہ بصد جزم تھا بیٹھا
پر دل جو پھرا تھا ہوسِ ملکِ فنا سے　　اور رُخ تھا بچائے ہوئے دنیا کی ہوا سے
نُور اُس کا تو آفاقِ جہاں گھیرے ہوئے تھا　　جس رُخ سے مگر دیکھئے مُنہ پھیرے ہوئے تھا

---

جو لوگ وہاں اہلِ طریقت سے تھے آتے　　سب اہلِ یقیں دل کی عقیدت سے تھے آتے
ملتی تھی جنہیں کچھ خبر اس رازِ نہاں سے　　اک عینک انہیں ایسی عطا ہوتی تھی واں سے
جو دل کے لئے مایۂ روشن گہری تھی　　اور بہر نگہ سرمۂ عالی نظری تھی

---

جوہر یہ کرامات کے تھے اُس کے اثر میں　　کر دیتی تھی ہر چیز کو ناچیز نظر میں
یا دور سے مقصد کو تھی نزدیک لے آتی　　اور سامنے اس طرح سے تھی کھینچ کے لے آتی
موجود کبھی ہوتے تھے مقصود نظر میں　　یکساں تھے کبھی بود و نابود نظر میں

---

تھا جلوۂ رُخ سامنے اُس مردِ خدا کا　　جو دفعتاً اک آ گیا جھونکا سا ہوا کا
قدرت کا تماشا وہ دکھاتا ہوا آیا　　اک پرچۂ اخبار اُڑاتا ہوا آیا
قاصد کی طرح آن کے قالب میں صبا کے　　رکھا بہ ادب سامنے اُس مردِ خدا کے

---

وہ نامہ دیا پیکِ صبا نے جو زمیں لا کر　　دیکھا اُسے تب خواجہ قناعت نے اُٹھا کر
طوفان طمع میں جو پڑی خلقِ خدا تھی　　اور چلتی زمانے میں ہوس کی جو ہوا تھی
تھے اُس میں بہ تفصیل وہ احوال سراسر　　اور تھے رقم ایک ایک کے احوال سراسر

اُس رقم پہ جب خواجۂ قناعت نے نظر کی
اور دیکھی یہ روداد بنی نوعِ بشر کی

آزردہ ہوا درد و محبت کے سبب سے
مُنہ پھیرا سوئے دستِ چپ اک بارِ غضب سے

اِس طرح سے گرجا کہ ہو جوں ابر گرجتا
یا شیر کہ ہو درد سے بے صبر گرجتا

معلوم ہوا تھا جو کچھ اخبار میں اُس کو
بھیجا ملک القدس کے دربار میں اُس کو

پر لوگوں کی نیت تھی جو دیکھی ہوئی اُس نے
اس واسطے ایک آپ بھی عرضی لکھی اُس نے

تحریر کئے اُس میں جو تھے حال یہاں کے
اور جن میں تھے آلودہ بد اعمال یہاں کے

لکھا کہ ہے عالم میں عمل بوالہوسی کا
ایمان ٹھکانے نہیں دنیا میں کسی کا

دیتے مری نیکی کا بدی میں صلہ مجھ کو
اور کہتے ہیں بے ہمت و بے حوصلہ مجھ کو

ہے ان کو ہوس طوق بہ گردن کئے پھرتی
کُتّے کی طرح سب کو ہے دردر لئے پھرتی

آنکھوں پہ لیا سر پہ جو آیا کوئی ٹکڑا
پر صبر و قناعت کا نہ پایا کوئی ٹکڑا

ہیں خواری و زاری کے لئے سارے حق اُس سے
اے کاش قناعت کا بھی لیتے سبق اُس سے

---

ایسے بھی ہیں اکثر کہ ہیں افلاس سے مرتے
دن رات پڑے ہیں اَلم و یاس سے مرتے

محنت سے جو برگشتہ ہے نیت ہوئی اُنکی
اور حد سے ہے گذری ہوئی بے ہمتی اُنکی

ہیں خانۂ ہستی میں وہ مکڑی کا نمونہ
تن ہو گئے ہیں سوکھ کے لکڑی کا نمونہ

تنتے ہیں خیالوں کے سدا تار گھروں میں
دن رات پڑے رہتے ہیں بیکار گھروں میں

جب دیکھو اپاہج کی طرح خوار ہیں گویا
بیٹھے ہوئے ایسے ہیں کہ مُردار ہیں گویا

---

اور ایسے بھی کچھ ننگِ خلائق ہیں جہاں میں
جو تن کو لئے بیٹھے ہیں راحت کی اماں میں

پر دل ہیں سدا کام سے ہیں جان چُراتے
اور جان کے پردے میں ہیں ایمان چُراتے

ہیں رنگ فقیری کا جمائے ہوئے بیٹھے — اور دام دغا اُس میں لگائے ہوئے بیٹھے
وہ تارکِ دنیا نہیں عقبیٰ کی غرض سے — دُنیا کو ہیں چھوڑے ہوئے دنیا کی غرض سے
ظاہر ہیں فقط زہد کی تصویر ہیں گویا — دل دیکھو تو شیطان کے بھی پیر ہیں گویا
ہے چاٹ زباں کو جو لگی مُفت خوری کی — پروا ہے اب ان کو نہ بھلی کی نہ بُری کی
جو ہو نہ کرنا یہ بد انجام ہیں کرتے — اور نام مرا مُفت میں بدنام ہیں کرتے

---

حالاتِ جہاں سارے کئے جب رقم اُس نے — تب کی یہ رقم پھر بزبانِ قلم اُس نے
یعنی مجھے رہنا یہاں منظور نہیں ہے — اور آپ کا دربار بھی کچھ دُور نہیں ہے
بُلوائیں تو بندہ ابھی اک آن میں آئے — واں آئیں تو پھر جان مری جان میں آئے
یہ حال ہیں اپنے ہیں ہوں گرفتار ہمیشہ — خواری میں جو خوش ہیں تو رہیں خوار ہمیشہ

---

دیکھا مَلِکُ القدس نے حالِ اہلِ جہاں کا — اور حال کُھلا اُن کے ہر اک رازِ نہاں کا
فرمایا اسی وقت کہ دربار ہو قائم — اور اُس میں اک آئینۂ اسرار ہو قائم
مخلوق کہ ہیں خاص سے تا عام جہاں میں — جاری ہوں اسی دم اُنہیں احکام جہاں میں
تا جملہ زن و مرد سے لے پیر و جواں تک — ہیں ہو چکے آفاق میں اور ہونگے جہاں تک
وہ آ کے حقیقت سرِ دربار دکھائیں — اور یاں انہیں آئینۂ اسرار دکھائیں
تا جوہرِ اصلی جو ہر اک دل میں نہاں ہوں — آئینہ میں وہ صورتِ آئینہ عیاں ہوں

---

جس دم یہ دیا حکم جہاندارِ جہاں نے — مشہور کیا خلق میں شہرت کی زباں نے
یاں سنتے ہی کُل خاص سے تا عام تھے جتنے — ارواح سے تا عالمِ اجسام تھے جتنے
جو جو کہ تھی مخلوقِ خدا نیک سے بد تک — اور ہو چکے یا ہونگے ازل تا بہ ابد تک

تحفے لئے ہاتھوں میں دل و جان کے حاضر  دربار مقدس میں ہوئے آن کے حاضر

---

بیٹھا ملک القدس بہ اورنگِ عدالت  چھایا ہوا آفاق میں تھا رنگِ عدالت
آئینہ کہ جوں شیشۂ افلاک تھا روشن  یا اہلِ صفا کا وہ دلِ پاک تھا روشن
پرتو فگن اُس میں تھے جو انوارِ حقیقت  کھُلتے تھے پڑے خلق کے اسرارِ حقیقت

---

دربار میں یک بار منادی نے ندا دی  اور گوشِ عقیدت میں وہیں سب کو سنا دی
یعنی کہ بہ ترتیب ہر اک فرقہ جُدا ہو  اور سامنے آئینہ کے حاضر بصفا ہو
دنیا میں کسوٹی ہے وہ ہر کھوٹے کھرے کی  اور دیتا ہے خبر ہے تہِ دل سے بھی پرے کی
جس شخص کی تصویر کہ اس میں اُتر آئے  باطن کی جو حالت ہے وہ ظاہر نظر آئے

---

اک فرقہ یکایک ہوا دربار میں حاضر  اور پہلے ہوا معرضِ اظہار میں حاضر
خوشحال بھی تھے اور زدہ احوال بھی اُنمیں  تھے حادثۂ دہر کے پامال بھی اُن میں
پر چتر لگائے تھا وقار اُن کے سروں پر  دولت کھڑی ہوتی تھی نثار اُن کے سروں پر
بھوکے بھی جو تھے اُن میں جو جی سیر تھے اُنکے  آہو شکمی نے کئے دل شیر تھے اُن کے
خالی نہ تھی سبب سے نہ یہ آہو شکمی بھی  اک بات میں تھی اُن کو قناعت کی کمی بھی
یعنی کہ بظاہر تھے تنکم و صل کمر میں  جس سے کہ سبک تھے کس و ناکس کی نظر میں
بھوکے تھے مگر فضل و کمالات کے سارے  محتاج اگر تھے تو اسی بات کے سارے

---

دیکھے ملک القدس نے جب حال سبھوں کے  آئینہ ہوئے جوہرِ اعمال سبھوں کے
اعزاز دوامی کے دئے تاج بھی اُن کو  اور ملکِ قناعت کے دئے باج بھی اُنکو

تا اہل جہاں میں رہیں ممتاز ہمیشہ — اور رہویں زمانہ میں با اعزاز ہمیشہ

---

بعد اُس کے گروہ اور اک آتا نظر آیا — اور اُس میں تماشا یہ نظر طرفہ تر آیا
آئے بہوس سب سے قدم مار کے آگے — پر پہنچے جب آئینۂ اسرار کے آگے
سر تا بقدم عکس ہوئے جلوہ گر اُس میں — اس طرح کے آئے وہ نظر جانور اُس میں
جن کے بدنوں پر نہ دہن تھے نہ گلے تھے — کھانے کے لئے سارے شکم ہو کے ڈھلے تھے
ملتی تھی نہ وہ شے کہ قناعت کریں جس پر — مانند مگس تھے کبھی اُس پر کبھی اس پر
تھے خواری و رسوائی میں دن کاٹتے پھرتے — اور ہونٹ تھے مکھی کی طرح چاٹتے پھرتے
پر ولولۂ حرص نہ ہوتے تھے کم اُن کے — غربال کی صورت تھے نہ بھرتے تھے شکم اُن کے

---

کچھ لوگ عجب رنگ دکھاتے ہوئے آئے — اور اپنے تماشے پہ ہنساتے ہوئے آئے
راحت طلبی اُن کو گرانبار تھی کرتی — اور زندگی اس طرح سے مردار تھی کرتی
ہل کر انہیں جانا تھا کہیں گور کا جانا — یا قید مشقت کی طرف چور کا جانا
آنے میں بھی تھے جان چرائے ہوئے آتے — لوگ اُنکو تھے کاندھے پہ اُٹھائے ہوئے لاتے
القصہ وہ جب بیچ میں دربار کے آئے — اور سامنے آئینۂ اسرار کے آئے
تھے سانڈ کہ سر ڈال کے ناچار کھڑے تھے — اور کرتے جگالی سر دربار کھڑے تھے

---

اور سٹے کے اوجھل میں جو عیار تھے بیٹھے — دن رات شکاروں کے طلبگار تھے بیٹھے
پردہ میں قناعت کے وہ تھے تیر لگاتے — اور دام و دغا تھے پئے نخچیر لگاتے
ظاہر میں بڑی تمکنت و شان سے آئے — لیکن نظر آئینہ میں شیطان سے آئے
روباہ کی صورت نظر آتے تھے وہ سارے — گرگٹ کے مگر رنگ دکھاتے تھے وہ سارے

جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے — آئینۂ حالات و خیالاتِ جہاں تھے
اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو — حیراں ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

---

بند آنکھیں کئے کیوں پھرے ایک ایک کے گھر تو — اپنے ہی چپ و راست ذرا غور تو کر تو
پہلو میں کہیں تیرے نہ وہ خانۂ دل ہو — آزاد وہ اپنا ہی نہ کاشانۂ دل ہو

## مثنوی مسمّٰی بہ ابرِ کرم

جو نکتہ باب ہیں کتابِ انقلاب کے — دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے
دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا — جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا
شاہانِ سلف کے مرقعِ عجیب ہیں — روشن سب اُس میں عہدِ بعید و قریب ہیں
تحریرِ تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے — آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
اِس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے — دم بھر میں صورت اور ہے دم بھر میں اور ہے
قانونِ انقلاب یہاں رسم و راہ ہے — موسم بہ موسم اس میں نیا بادشاہ ہے
اب یاں جو چند روز سے قانون عام ہے — گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے
عالم تھا شعلہ خیز فلک شعلہ ریز تھا — اک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا
منہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی — اور گرد چار سُو تہِ افلاک اُڑ رہی
دنیا میں بوند کو خلقت ترس رہی — پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے — اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے
طفلِ نبات پیاس کے مارے بلک گئے — خلقِ خدا کے نالے بہت دور تک گئے

سیراب ہو کے سینہ سے ہر دل نکل چلا — اور آفتاب شمع کی صورت پگھل چلا
دل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے — انساں تڑپ کے ماہیِ بے آب ہو گئے
پر اب ہے دَور دَورِ شہِ برشگال کا — چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا
گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا — اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا
قربانِ راحتِ سحر و شام آگیا — خلقِ خدا کی جان کو آرام آگیا

---

اے ابر آ کہ تُو تو شہِ برشکال ہے — جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اور — تیری زمیں ہے اور ترا آسماں ہے اور
نوروز آب و رنگِ بہارِ جہان ہے — تُو تو بہارِ کشورِ ہندوستان ہے

---

اے ابر جوشِ سبزۂ و گلشن نہیں ہے یہ — پھولوں نہیں سماتی خوشی سے زمیں ہے یہ
مدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو — آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو
آنے سے تیرے آگیا آنکھوں میں نور ہے — دیوار و در سے آج برستا سرور ہے
تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے — سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

---

ہر قطرہ تیرا قطرہ ہے آبِ حیات کا — یا تا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا
تو دودھ ہے نبات کے اطفال کے لئے — اور زندگی درختِ کہن سال کے لئے
اے ابر زور کیا کہوں میں تیرے تیر کے — دانہ پہاڑ کو ہے نکل آتا چیر کے
سب تجھ سے نونہالِ چمن سبز بخت ہیں — اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں
یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے — ہیں حوصلے بہار کے باہر نکل پڑے

گہ پیرہنِ سبز اُڑھاتا زمین کو ہے
پھولوں سے گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے
گردوں پہ کرتا عالمِ نیرنگ ہے کبھی
دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی
سیماب صبح میں کبھی شنگرف گھولنا
اور وہ نگار خانۂ چینی کا کھولنا
لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے
کرتا فلک کو بادلوں سے دگلہ پوش ہے
یوں رنگ دمبدم جو بدلتا جہاں کے ہے
اے ابر سیکھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

---

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ اوج کے
دَل بادل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے دیو زاد کی صورت بنائے تو
اور بال و پر سمند کے ہے اڑتا لگائے تو
اُس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب
اے ابر تیرے ساتھ یہ دمساز ہے غضب
بل بے تری گرج کہ دلِ زار ہل گئے
ہیبت سے رعد و برق کی کہسار ہل گئے
لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں آرہی
اور ٹھینوں کے سازوں پہ سُر ہیں ملا رہی
کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا
اور میٹھی بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا
اے ابر سب یہ ساز و نوا تیرے دم سے ہیں
یہ لطفِ عیش و لطفِ ہوا تیرے دم سے ہیں

---

غنچوں کے مارے پیاس کے تھے مُنہ کھُلے ہوئے
گلشن کے نونہالوں کے منہ تھے ڈھلے ہوئے
انسان پھرتے پیاس سے تھے بدحواس سے
مُنہ کھولے تھے کبوتر و کنجشک پیاس سے
رونق سبھوں کے مُنہ پہ ہے اس آن آگئی
آنے سے تیرے جان میں ہے جان آگئی

---

تیرا خطاب رحمتِ پروردگار ہے
خلقِ خدا کے رزق کا تُو ذمہ دار ہے
سرمایہ تُو ہی دیتا ہے تجار کے لئے
اور سایۂ ہما ہے زمیندار کے لئے

اے ابر وہ جو خلق میں دہقان پیر ہیں — عمریں ہوئیں لکیر پہ بیٹھے فقیر ہیں
اُن کو امید تھی۔ نہ کسی کی پناہ تھی — تجھ پر نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی
آج اپنے رنج و فکر سے اُن کو فراغ ہیں — ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

---

اے ابر تیرے فیض کا ہر جا وفور ہے — ہر کوہ و کوہسار میں کچھ اور فیض ہے
ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے — اور گلبنوں سے لے کے شجر تک ہرے کھڑے
چشمے ہیں جا بجا تری رحمت کے بہ رہے — گویا زبانِ موج سے ہیں وصف کہہ رہے

---

ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا — ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا
اب پوچھتا فلک سے ہے مقدار اوج کی — دیکھو میں آیا توڑ کے زنجیریں موج کی
دیوانہ وار کف بہ لب آب مارتا — گاہے تھپیڑے ہے گہے گرداب مارتا
یہ جوش یہ خروش سماں ہے دکھا رہا — ہر موج میں ہے نوح کا طوفان اُٹھا رہا

---

پر مجھ کو رشک ہے اُسی مستِ مدام پر — جس کی کہ مے کشی نہیں موقوف جام پر
مستانہ پن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی — مستانے ساتھ رکھتا ہے دو چار اور بھی
سبزہ پہ لوٹتا ہے و باغ آسماں پہ ہے — اور وہ مدام یہ مطلع موزوں زباں پہ ہے
یوں پھوٹ کر جو ہیں گل و ریحاں نکل پڑے — کیا جانے کن دلوں کے ہیں ارماں نکل پڑے

---

اس وقت تو چھایا ہوا ہے جہان پر — چھایا ہوا سماں ہے زمیں آسمان پر
چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر — اور اُٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی — سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

آتی ادھر صبا ہے اُدھر سے نسیم بھی
اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آئی شمیم بھی

مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزہ کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

اِن سبز سبز کیاریوں پر دل ہیں لوٹتے
طوطی برنگِ طائرِ بسمل ہیں لوٹتے

شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی
موتی بکھیرتی ہے جواہر لٹا رہی

سبزہ کے برگ برگ میں موتی جڑے ہوئے
شاخ و شجر تمام مرصع کھڑے ہوئے

پتّوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں
ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں

شبنم کا جوش گر یہی طوفاں اُٹھائے گا
ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائے گا

لو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آ گئے
اور شامیانے شرق سے تا غرب چھا گئے

کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
برسے گا آج خوب دھواں دھار ابر ہے

آیا اُمنڈ گھمنڈ کے عجب دھوندو کار ہے
نودن کی گر لگا دے جھڑی تو بہار ہے

لیکن یہ باجرا سا برسنا پھوار کا
سہے گا پیام ابرِ بہاری کے تار کا

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے

آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روئے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا

گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے

ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں
آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں

کوئل کا دُور دُور درختوں پہ بولنا
اور دل میں اہلِ درد کے نشتر گھنگولنا

طاؤس کا وہ دُم کو چنور کر کے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جانچنا

لیکن چمن سے ناچ کے چلنا جو مور ہے
اک قہقہہ یہ طنز لگاتا چکور ہے

املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا — اور ساتھ اس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا
جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے — اور بیچ آم کے ہیں پپیہے بجا رہے
ساون کے گیت اٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں — پردیسیوں کی یادوں سے ارماں دلوں میں ہیں
ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے — بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

---

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں — لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں
کیا کیا بیاں کروں میں تری رات کا مزا — گر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزا
سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا — چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے — کرتی نقابِ ابر میں جھمک ہے ناز سے
اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے — نالہ کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے
کوٹھے یہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں — ہے فخرِ گل کو آوے اگر پائے بوس میں
آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی — بول اٹھنا مرغِ نغمہ سرا کا کبھی کبھی
آرام کہہ رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو — قسمیں ہے دیتی نیند کہ بس اب تو سو رہو
آزاد لکھتے لکھتے ہی آدھی تو ڈھل گئی — اور شمع لالٹین میں ساری پگھل گئی

طولِ امل کو اپنے اب انجام دیجئے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجئے

# مثنوی زمستان

اے زمستاں کہ ہے تو بادشہِ برفانی — شاہِ برفانی و شاہنشہِ برفستانی
تختِ اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا — اور ہے دربارِ سرِ کوہِ ہمالا تیرا

شرق تا غرب ترا ملک ہے بطرف سفید
اڑ رہا پرچم اقبال ہے جوں برف سفید

جبکہ عالم پہ ہے تو لشکر جنگی لاتا
کوہ و صحرا کو برابر ہے الٹتا آتا

باد صرصر ہے نشاں تیرا اٹھاتی آتی
فوج اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی

طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیر جہاں
تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیر جہاں

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھوکا جاتا
مارے ہیبت کے ہے دل سینوں میں تھرّا جاتا

ہے نباتات کا عالم تہ و بالا تجھ سے
پر نرے پر نرے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے

باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھوکا آتا
ڈر کے ہر برگ ہے پیوند زمیں ہو جاتا

تیرے سنّاٹے سے ہوتی ہے ہوا جان نبات
خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلان نبات

تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانان چمن
منہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحان چمن

ہیں شجر سر بہ کھڑے خاک اڑاتے سارے
گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے

نغمہ سنجان چمن پر ہیں پھلائے بیٹھے
اور پر و بال میں ہیں منہ کو چھپائے بیٹھے

باغباں کا جو گلستاں میں گزر ہوتا ہے
لب حیرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے

یاالٰہی وہ جوانان چمن ہو گئے کیا
باغ سنسان ہے مرغان چمن ہو گئے کیا

راز غم کس سے کھلے باغ میں بلبل بھی نہیں
کان میں پوچھئے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں

نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو منہ کھولے
نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے

کہو درختان چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں
ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیران کیوں ہیں

اے زمستاں جو ہوئی خامہ سے ہے بوالعجبی
فی الحقیقت ہوئی خدمت میں تری بے ادبی

تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی
دفع زہر حشراتی کی ہے آفت ہوتی

خلق سے دفع وباؤں کی بلا ہوتی ہے
اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے

خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے
پاتا ہر میوۂ شیریں ہے عذوبت تجھ سے

تو نے ہے صاف جہاں قاف سے تا قاف کیا
شیشۂ گنبد فیروزہ سے شفاف کیا

مخمل و قاقم و سنجاب سکھاتا تو ہے | بہت اشعارِ تر و خشک کھلاتا تو ہے
تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا | تھا نہ کھانے ہی کا کچھ اور نہ پینے کا مزا
اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں | گرم کھاتے ہیں غذا آب خنک پیتے ہیں

---

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا | اور بغل سے دلِ وحشت زدہ نکلا جاتا
یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے لیتے | آگ ہاتھ آئے تو ہیں دل میں چھپائے لیتے
مارے سردی کے جگر سینوں میں تھرائے ہیں | بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا | پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے | کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
کچھ لحافوں سے ابھی منہ کو نکالے ہیں پڑے | لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے
سمٹے سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں | ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں
کہیں سوں سوں کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی ہے | گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے
حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے | رونگٹے ہو گئے سردی سے کھڑی قالی کے
اسکی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے | پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے
خلق سے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی | تن تو ٹھنڈے ہیں پر سینوں میں ہے آگ لگی
ہر نفس بھانپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں | دل میں ہے آگ لگی منہ سے اگلتے ہیں دھوئیں

---

تیرے افضال سخاوت نہ انطاک ہیں عام | ملتی سب اہل جہاں کیلئے پوشاک ہے عام
اہل دولت کو ہیں خلعت میں دوشالے ہوتے | غربا سارے ہیں کمل کے حوالے ہوتے
کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست | ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست
جان عالم ہیں الگ بسترِ مخمل میں پڑے | فقرا لپٹے ہیں سب ایک ہی کمل میں پڑے

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف　　تیری شبہائے دراز اور وہ ہر بات کا لطف
کی تری رات نے داناؤں کی ہی بات بڑی　　کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی
ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا　　اور جو بچہ ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا
بزم احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے　　ساز عشرت کے لئے برگ و نوا ہے تجھ سے
شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا　　پان کھانے کا گلاوری کے چبانے کا مزا
یار حقے کے ترے دور میں لیتے ہیں مزے　　دو دو تلخ اس کے سوا دود سے دیتے ہیں مزے
گھونٹ حقے کا یہ ہر دم نہیں ہم بھرتے ہیں　　اے زمستاں یہ ترے عشق کے دم بھرتے ہیں
صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے　　مایۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے
ہر طرف ہے گی پیالی پہ پیالی آڑتی　　گھے نہ ہوے تو ہے تصویر خیالی اُڑتی
بے نشے مست پڑے شکر خدا کرتے ہیں　　چائیں پی پی کے ترے سر کو دعا کرتے ہیں

---

شب سرما میں اگر لطف ہے مے نوشی کا　　تو اسی شب سے ہے مزا مجلس خاموشی کا
ہیں کبھی عالم ارواح کے مہماں آتے　　بزم دربار میں ہیں صاحب فرماں آتے
دل کے ایوان میں ہیں وہ آ کے عدالت کرتے　　ہیں کتابوں کے وکیل اُن کی وکالت کرتے

---

جلوہ گر پیش نظر ہوتی ہے فانوس خیال　　پھرتے ہیں چار طرف دوڑتے جاسوس خیال
بیٹھا جمشید کہیں دیکھتا ہے جام اپنا　　پر سمجھ میں نہیں آتا ہے کچھ انجام اپنا
دوش ضحاک پہ آتے ہیں کبھی مار نظر　　سر ضحاک ہے آتا بہ سر دار نظر
گرز کو دوش پہ رستم ہے اُٹھائے جاتا　　ہفتخواں میں ہے کبھی رخش اُڑائے جاتا
کبھی سہراب سر خاک نظر آتا ہے　　باپ بھی غم سے جگر چاک نظر آتا ہے
کہیں دربار سکندر کہیں بزم دارا　　اور کہیں عزم سکندر ہے بہ رزم دارا

تنِ دارا ہے کہیں بے سرو افسر ہوتا — اور سرہانے ہے کھڑا اُسکے سکندر روتا
خضر کے ساتھ سکندر کہیں ظلمات میں ہے — کبھی نوشابہ سے مصروف ملاقات میں ہے
ژند و پاژند کو زرتشت سُناتا ہے کبھی — شعلہ در آب میں آتش کو دکھاتا ہے کبھی
کبھی محمود ہے چڑھ کر سرِ جے پال آتا — کشورِ ہند میں گویا کہ ہے بھونچال آتا
نقشہ نعمان خورنق کا جماتا ہے کبھی — ستمار اپنے کٹے ہاتھ دکھاتا ہے کبھی
گاہ چنگیز ہے اور گاہ ہلاکو آتا — جیسے گھر لوٹتا ہووے کوئی ڈاکو آتا
جب بہت طول پکڑتی ہے شبِ بیجوری — لیکے تیمور ہے آتا تزکِ تیموری
ہند سے گرچہ بہت جلد چلا جاتا ہے — پشت در پشت مگر سکہ جما جاتا ہے
بزمِ افسانہ میں واں خسرو پرویز بھی ہے — باربدؔ زمزمہ سے اپنے شکر ریز بھی ہے
قصرِ شیریں سے ہے فرہاد بھی دلگیر آتا — پر بغل میں لئے شیریں کی ہے تصویر آتا
خونِ فرہاد سے تیشہ سے ہے کھلاتا لالہ — چادر اوڑھے ہے کھڑی پیرزنِ دلالہ

---

ہیں یہاں انجمنِ علم کے جو صاحبِ راز — فصلِ سرما میں ہیں جب دیکھتے شبہائے دراز
خانہ مول میں وہ اک بزم ہیں قائم کرتے — منعقد مجلسیں اربابِ عمائم کرتے
فخر رازی کبھی سے آتے ہیں تفسیر کبیر — بوعلی آکے سناتے ہیں شفا کی تقریر
ہوتی ہیئت کی مجسطی سے ہے توضیح وہاں — کبھی ہوتی ہے سطرلاب کی تسطیح وہاں
ہے کوئی جلد و دلائل کو مجرّے کرتا — کوئی ابطال جُزِ لا یتجزّے کرتا
ہے دلائل سے خدا کو کوئی [illegible] باطل کرتا — پر ہے دانائے فرنگ اسکو بھی قائل کرتا
دفعۃً چھاتی ہے مجلس پہ ہوائے یوناں — یعنی تشریف ہیں لاتے حکمائے یوناں
ہے فلاطوں لئے اشراق کے آئینہ کو — کرتا آئینہ سے ہے صاف سوا سینہ کو
ہے ارسطو جو کبھی بزم میں آجاتا ہے — باتوں ہی باتوں میں ہر مشکل مٹا جاتا ہے

رکھتے ہیں جو کہ طبیعت میں ہوائے چمنی — چلتی ہے اُنکی طبیعت پہ ہوائے چمنی
آکے سودا کبھی اک ہجو سنا دیتے ہیں — لیکن اس طرح کہ محفل کو لٹا دیتے ہیں
پھر کبھی بڑھ کے سُناتے ہیں قصیدہ اپنا — میر پڑھتے ہیں کوئی شعر گزیدہ اپنا
ناسخ و آتش و انشاؔ و نصیرؔ آتے ہیں — غالب و ذوق مگر خاتمہ کر جاتے ہیں

---

ہوتی ہے اتنے میں ہے افلاک پہ تنویر سحر — ٹپکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیر سحر
سر پہ اپنے وہ بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید — ریش پُر نور میں ہے جلوہ نمارُوئے سفید
شجر طُور کا عالم ہے بنا تا آتا — ساتھ ہے کوہ ہمالہ کو اُٹھاتا لاتا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے — ملک تا تار کی تصویر دکھا دیتا ہے

---

گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور — اے زمستاں ترے اِس ملک میں آئین ہیں اور
ایک جھوکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے — تو نباتات کا سب رنگ بدلجاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک — کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک
واں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت — زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیر اکس نے — آب زر روئے نباتات پہ پھیرا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا — پتے پتے کو جلاتا ہوا ایک سخت آتا
دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے — جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
ہر شجر پر ہے غرض رنگ بدل کر آتا — کہیں زر کا رہے آتا کہیں سکر آتا

---

پر ترے حکم کے جھونکے میں سوا تیزی ہے — کہ نباتات پہ طوفان بلا ریزی ہے

برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سرِ خاک پڑے — اور شجر سب ہیں برہنہ تہِ افلاک کھڑے
دفعتاً پیرِ سحر سانس سے بھرتا ایسا — یا زمانہ پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا
کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یکبار سفید — دشت و کہسار سے تا در و دیوار سفید
ابر کی طرح بخارات کا گھر کر آنا — برف کے پردہ میں وہ روئی دُھنکتے جانا
ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اُڑتے — اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اُڑتے
جا بجا آبِ رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے — اور سرچشمہ میں شیشے کی طرح جم جاتے
جو شجر گلشنِ ہستی میں برہنہ تھے کھڑے — یا کہ پتوں کا بڑھائے ہوئے گہنا تھے کھڑے
شجرِ نور سرِ طور نظر آتے ہیں — سربسر غیرتِ بلور نظر آتے ہیں

---

ہیں زمستاں ترے سب کام زمانہ سے الگ — یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ
جامِ گردوں میں ہے تو شیر جماتا کیونکر — اور ہوا میں ہے تباشیر اُڑاتا کیونکر
ابرِ باراں تو ترے چرخِ بریں دیکھا تھا — پر برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

---

جبکہ ہوتا ہے گزر جانبِ کہسار ترا — فنِ صنعت سے وہاں اور کچھ اے یار ترا
بت تراشی میں ہے تو غیرتِ فرہاد وہاں — قصرِ شیریں کی ہے تو ڈالتا بنیاد وہاں
اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا — صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا
پتے پتے کا ہے تصویر میں انداز درست — اور ہر اک میوہ ہے قدرتِ خدا ساز درست
اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے وہیں — برف کا اسپ سبک خیز بھی ہوتا ہے وہیں
ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی — اور پری ہے پرِ پرواز سے تیار کھڑی
چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کر جاتا ہوں — اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں
برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا — اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اٹھائے بیٹھا

شیر وابستۂ زنجیر بناتا ہے وہاں    اور کبھی فیل کی تصویر بناتا ہے وہاں
کبھی انساں کبھی حیوان بنا دیتا ہے    اور کبھی صورتِ شیطان بنا دیتا ہے

---

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تو    تو کبھی رشکِ دہِ مانی و بہزاد ہے تو
برف سے جب ہے تکھر تا فلکِ زنگاری    اور تری طبع ہے آتی سوے رنگیں کاری
کسی صیاد کو ہے کر کے ضیافت لاتا    اور کوئی صید ہے سرگشتۂ آفت لاتا
لیتا پھر کارِ قلم ہے دمِ شمشیر سے تو    اور ہے شنگرف کو لیتا رگِ نخچیر سے تو
کی سرِ خاک جو تھی برف نے سیمیں کاری    خون بے جرم سے کرتا ہے اسے گلناری
صیدِ نومید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے    تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

---

ہے گزر جب کہ ترا جانبِ دریا ہوتا    اک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا
ایسا تو حکمت و جادو سے جماتا ہے اسے    سربسر تختۂ الماس بناتا ہے اسے
کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں    جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہیں ڈاریں جاتیں
پل ہیں لے کشتی و پل پار اتر جاتے ہیں    سفری سیکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں
روئے دریا پہ گزر مثلِ نظر ہوتا ہے    ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

---

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملکِ فرنگ    اے زمستاں ہیں وہاں تیرے عجب عیش کے رنگ
بارہ سنگے کہیں بگھی ہیں اڑاتے جاتے    جلوۂ تختِ ہوا اور دکھاتے جاتے
نوجواں ہیں کہ جوانی کی شرابوں سے ہیں مست    پہلواں بے مے و بے جام شرابوں سے ہیں مست
ہے زبس جوشِ دلی حوصلہ انگیزی میں    سب کمر بستہ ہیں میدانِ سبک خیزی میں
پاؤں میں کاٹ کے موزوں کو چڑھائے ہیں کھڑے    اور عصا اپنے سر برف جمائے ہیں کھڑے

قدم آگے کو رپٹ کر ہیں کھسکتے جاتے | یہ اچھل جاتے ہیں آگے کو پھسلتے جاتے
کوئی گھڑدوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا | پر رپٹ دوڑ کا میدان نہ مارا ہوگا

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی | مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
دیکھ کاغذ کا ورق ہاتھ میں تھراتا ہے | اور قلم ہاتھ سے تھرا کے گرا جاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا چھپائے لیتا | منہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لیتا
مرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا | ترے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
آرزو کچھ نہیں دنیا کی رہی ہے دل میں | اب تمنا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں

طپشِ عشق سے دل رہوے مرا نرم سدا
گرمیٔ شعر و سخن سے سینہ رکھے گرم سدا

## مثنوی مصدرِ تہذیب

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی | اور آفرینشِ عالم کی تھی سحر پہلی
مزاج جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا | اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا
وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی | اور ابتدا تھی زمانہ کے کارخانہ کی
اُفق میں تھا کوئی کافور اُڑا رہا گویا | زمیں سے تا بفلک نور اُڑا رہا گویا
کنارِ کوہ پہ سورج تھا دیتا دکھلائی | کہ جیسے گیند طلائی ہوا میں کُڈ کائی
دکھا کے گوشۂ ابرو ذرا چمک جانا | لحافِ ابر میں منہ دیکے پھر دبک جانا
کبھی پہاڑ پہ سر بھی اُبھار لیتا تھا | شفق کے خون میں پھر غوطہ مار لیتا تھا
وہ دن جہاں میں تھا نور روزگار کا دن | جدھر کو دیکھئے گویا کہ تھا بہار کا دن

ہوا میں فیضِ مسیحا کی شان تھی گویا
کہ آتی قالبِ بیجاں میں جان تھی گویا
پڑے چھلکتے گلوں کے ایاغ تھے سارے
کھڑے لہکتے جوانانِ باغ تھے سارے
سحر کا فیض جو ہر خشک و تر پہ طاری تھا
تو آبِ بحر بھی کس کس مزے سے جاری تھا
دلوں کو موج کے دریا میں اضطراب نہ تھا
ہوا کے صدمہ سے رکھتا خطر حباب نہ تھا
نہ خوفِ لطمۂ و گرداب غوطہ بازوں کو
نہ فکرِ بادِ مخالف کا تھا جہازوں کو
جو اپنی حد سے ہوا کچھ زیادہ ہوتی تھی
تو ناخداؤں کو بادِ مراد ہوتی تھی

---

زمین سبزۂ قدرت سے لہلہاتی تھی
صبا جو اُس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی
تمام دشت و چمن در چمن پڑے ہوئے تھے
بہار پھولوں سے دامن بھر کھڑے ہوئے تھے

---

شغل مہر کا تھا ہر جگہ پہ کام جُدا
ہر ایک کام میں کرتی تھی اہتمام جُدا
ہوا میں پھیل کے مقیش تھی اُڑا دیتی
زمیں پہ جا در مہتاب تھی بچھا دیتی
جگہ میں شاخ کے پانی کو خوں بناتی تھی
اور اُس کے خوں کو گُلِ لالہ گوں بناتی تھی

---

نگاہ ایک سی تھی سوئے خشک و تر اُسکی
گزر رہی تھی دلِ سنگ میں نظر اُسکی
کبھی جو تھی نگہِ لطف سرسری کرتی
تو دل میں کوہ کے تھی کیمیاگری کرتی
کہیں جو سنگ کو گرمی سے تاب دیتی تھی
تو اُس کو لعل و زمرد کی آب دیتی تھی

---

غرض کہ خلق میں دریا تھا فیض کا جاری
اور اُن میں کارِ خدائی تھے جابجا جاری
اُٹھی دمامۂ دولت سے دفعتًہ یہ صدا
اُٹھی جہاں میں تہِ گنبدِ کہن یہ صدا
اُٹھو کہ صبحِ سعادت کی نوبت آئی ہے
نظر کرو کہ عیاں شانِ کبریائی ہے

صدا کے ساتھ اُڑے سب کے خواب آنکھوں سے — دلوں سے اُٹھ گئے پردے حجاب آنکھوں سے
نظر اُٹھا کے جو دیکھا عیاں ہے نامِ خدا — کھُلا ہے فیض کا در بہرِ بندگانِ خدا
جلوس ہے ملک القدس کا بروئے سریر — نگاہ ذرّہ تو خورشید ہے بسوئے سریر
زبسکہ ذاتِ مقدس ہے اُسکی ذاتِ کمال — کھڑے ہیں دستِ ادب باندھے صفاتِ کمال
صفاتِ ذاتِ اراکینِ دولت اُسکے تھے — بنائے دولت و سامانِ صولت اُسکے تھے

---

زبسکہ فیضِ سحر تھے دلوں پہ چھائے ہوئے — ظہورِ قدرتِ حق آنکھوں میں سمائے ہوئے
تھی اعتدال پہ جو واں کی بات ہوتی تھی — نہ دھوپ تیز نہ تاریک رات ہوتی تھی
شعاعِ مہر زیادہ چمک نہ سکتی تھی — اور اُسکی نوکِ نگہ میں کھٹک نہ سکتی تھی
کرن ہو تیز تو تھی دھوپ وہ اس سے ٹل جاتی — بہت جو ہوتی اندھیری تو رات ڈھل جاتی

---

رواج عیب کا جلتا وہاں چراغ نہ تھا — دھواں بدی کا پہنچتا پئے دماغ نہ تھا
تھا رات دن کا برابر تُلا حساب وہاں — ہمیشہ رہتا تھا یکساں ہی آفتاب وہاں
ہوا کے واں چلن آکر درست ہوتے تھے — جو صرصر آئے تو زور اُسکے سُست ہوتے تھے
کبھی نسیم تھی آتی کبھی صبا آتی — اور اس روش سے وہ پھولوں کو تھی سجا جاتی
کہ آب و رنگِ جہاں رونقِ بہار سے ہو — نہ گُل کے پہلو کو صدمہ نہ نوکِ خار سے ہو

۲

---

جو مارِ طبع تھے واں آ کے سیدھے چلتے تھے — اور اُن کے ڈنکے کی مانند بل نکلتے تھے
زیادہ و کم کو وہاں اعتدال تھے گویا — جو بد سے تھے نیک باصلاح حال تھے گویا
جو بد مزاج تھے واں خوش مزاج ہوتے تھے — سبھوں کی کج روشی کے علاج ہوتے تھے

وہ شاہ لطف سے تھا کر رہا جہاں پہ نظر　　کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر
خدا کے بندوں پہ الفت زبس تھی عام اسکی　　فروغ عام تھی مثلِ مہِ تمام اس کی
وہ جوشِ الفتِ دل کام کرکے پردہ میں　　یکایک آنکھوں سے نکلا نظر کے پردہ میں
تھا حسنِ خلق جو پھیلا رہا شمیم اسکی　　اسی پہ خاص تھی الفتِ عمیم اس کی
دیا یہ حکم کہ تم سوئے خلق جاؤ ذرا　　ہمارے لطف کا جلوہ انہیں دکھاؤ ذرا
دلوں کی مملکتوں کا خراج اسکو دیا　　بہارِ گلشنِ جنت سے تاج اس کو دیا
ہر ایک پھول کو سو رنگ و بو سے چمکا کر　　اور اس پہ شبنمِ آبِ حیات برسا کر
کیا بجانبِ ملکِ فنا روانہ اُسے　　کہ ہو قیامِ قیامت تلک فنا نہ اُسے

---

غرض کہ خسروِ اخلاق خلق میں آیا　　شمیمِ خلق سے باغِ جہان مہکایا
حسنِ خلق سے تسخیر کر لیا سب کو　　کہ جیسے بستۂ زنجیر کر لیا سب کو
بہارِ خلق سے اسکے ہوا چمن عالم　　اور اُس کے نور سے انجم کی انجمن عالم
شگفتہ روئی پہ صدقے بہار ہوتی تھی　　دہن پہ خندۂ جبیں نثار ہوتی تھی
وہ منہ سے بات جو کرتا تو پھول جھڑتے تھے　　جو چپ رہے تو چمن آگے پاؤں پڑتے تھے
کیا نہ دل میں بد و نیک کا خیال اس نے　　ہر اک کو کر دیا خوشحال حسبِ حال اسنے
جہاں میں بحرِ کرم اس کی ذات تھی گویا　　وہ ذات چشمۂ آبِ حیات تھی گویا
رہا بسکہ نہ محروم اس ابرِ تر سے کوئی　　پھرا نہ خلق میں ناکام اسکے در سے کوئی
تو مدح خواں ہوئے سب اہلِ روزگار اسکے　　دئے زمانہ میں شہرت نے اشتہار اسکے
اُمنڈ کے لوگ یہ نزدیک و دور سے آئے　　کہ جیسے مور و ملخ ہوں وفور سے آئے
وہ اس کے بندۂ بے دام ہوگئے سارے　　غلام خاص سے تا عام ہوگئے سارے

درِ امید کھلا تھا ہمیشہ سب کے لئے ‏ ‏ نہ حکم خاص تھا ان کا نہ قید شب کے لئے
اگرچہ بہر بد و نیک تھا کھلا دربار ‏ ‏ دلِ سخی کی طرح تھا ہمیشہ وہ دربار
زیادہ سب سے قباحت یہ روبکار آئی ‏ ‏ کہ بزمِ جشن میں خلقت جو ایک بار آئی
تو خاص و عام وہاں آکے باریاب ہوئے ‏ ‏ سبھوں کو واں سے عطا خلعت و خطاب ہوئے
انہی میں ہزل و تمسخر کے بھانڈ بھی آئے ‏ ‏ ظرافتوں نے بہت باغِ سبز دکھلائے
لطائف ان کے یہ دربار کو پسند آئے ‏ ‏ کہ شہ کی خدمتِ عالی میں سربلند ہوئے
رہے جو خلوت و جلوت میں روز و شب داخل ‏ ‏ مصاحبوں میں ہوئے رفتہ رفتہ سب داخل
غرضکہ ہزل و تمسخر ہوئے وزیر اسکے ‏ ‏ بہت سے اہلِ ظرافت ہوئے امیر اسکے
اثر زمانے پہ اس کی مگر بجا نہ ہوا ‏ ‏ جو اس کو مدِ نظر تھا وہ مطلقاً نہ ہوا
ادب کے طور طریقے بگڑ گئے ان کے ‏ ‏ قدم طریقِ وفا سے اکھڑ گئے ان کے
رہا دلوں پہ نہ رعب اس کی حکمرانی کا ‏ ‏ سمجھ کے پی گئے سب اسکو گھونٹ پانی کا
حیا و شرم و ادب سے خلاف کرنے لگے ‏ ‏ ادب کے قاعدوں سے انحراف کرنے لگے
ہر ایک بات میں چالاکیاں لگے کرنے ‏ ‏ حضورِ شاہ میں بے باکیاں لگے کرنے
وہ حسنِ خلق تمسخر کا نام رکھتے تھے ‏ ‏ جو بات کہتی نصیحت تو نام رکھتے تھے

---

یہ دیکھا خسروِ اخلاق نے جو حال ان کا ‏ ‏ اور ان کے حال نے دکھلا دیا مآل انکا
اگرچہ خلق و مروت کا بادشاہ تھا وہ ‏ ‏ اور ایسی باتوں پہ رکھتا نہ کچھ نگاہ تھا وہ
پر اس نے دیکھا کہ ان میں وفا نہیں باقی ‏ ‏ اور ان کی آنکھوں میں شرم و حیا نہیں باقی
رقم کیا ملک القدس کو یہ حال ان کا ‏ ‏ لکھا کہ حال سراسر ہے پُر وبال ان کا
شتاب چشمِ کرم سے نگاہ ہو جائے ‏ ‏ کہ روئداد جہاں روبراہ ہو جائے

غرض جو تھی شہِ اخلاق نے لکھی عرضی — وہ بزمِ قدس میں ساری پڑھی گئی عرضی
وہاں نگاہ توجہ کمال اُس پہ ہوئی — بہت سی قدسیوں میں قیل و قال اُس پہ ہوئی
بدوں کی ساری بداطواریاں بھی دیکھی گئیں — ظرافتوں کی ستمگاریاں بھی دیکھی گئیں

---

غرض کہ بزمِ مقدس میں گفتگو کر کے — ہر اک کے ظاہر و باطن میں جستجو کر کے
کھلا کہ ہو گئے بیباک یہ جو سارے ہیں — اور اس میں سارے بد اعمالیوں کے مارے ہیں
تو بے سبب نہیں گستاخیوں میں آئے ہوئے — یہ حسنِ خلق کے ہیں سارے گل کھلائے ہوئے
سو **قوتِ غضبی** کو ذرا اشارہ ہو — کہ ساتھ اُس کے عمل میں حکومت آرا ہو
وہ حسنِ خلق سے مل کر دوا کا کام کرے — جو دل مریض ہیں اُن پر شفا کا کام کرے

---

غرض کہ **قہر** کو فرمانِ خسروانہ ہوا — بلا کی طرح سے وہ دفعتہً روانہ ہوا
چلا وہاں سے مگر اس کڑک دمک سے چلا — کہ جیسے شعلۂ ہاروت ہو بھڑک کے چلا
بسانِ اژدرِ خونخوار سر اُٹھائے ہوئے — اور اُس پہ کلّۂ شیرِ سیہ چڑھائے ہوئے
دھوئیں نے آگ کے سانچے میں اُس کو ڈھالا تھا — جلا ہوا تھا دل ایسا کہ رنگ کالا تھا
یہ تن پہ اینٹھے تھے غیظ و غضب کے مارے بال — کھڑے تھے شیر کی مونچھوں کی طرح سارے بال
تھے مارے طیش کے نتھنے پھڑک رہے دونو — برنگِ شعلہ تھے دیدے چمک بھڑک رہے دونو
یہ پیچ و تاب میں تھا اپنے زہر کا مارا — کہ دانت پیستا آتا تھا قہر کا مارا
غضب سے چہرہ پہ گویا جنوں برستا تھا — جو دیکھتا تو نگاہوں سے خوں برستا تھا
گرج تھی ابر کی اور آندھی اُس کے ساتھ میں تھی — بجائے تیغ کڑک کی بجلی اُس کے ہاتھ میں تھی
خود اک بگولے کے اوپر سوار آتا تھا — غبار آگے اُڑاتا شرار آتا تھا

غرض کہ آیا اور اِس آن بان سے آیا — کہ جیسے قہرِ خدا آسمان سے آیا
وہ اُس کا آنا جہاں پر غضب کا آنا تھا — نہ اُس کا نیک تھا اپنا نہ بد بیگانا تھا
پڑے تھے تہلکے دُنیا کے کارخانے میں — اور اُسکے آنے سے بھونچال تھے زمانے میں
وہ دونوں ہزل و تمسخر جو تھے وزیروں میں — اور اُنکے ساتھ ظرافت کہ تھی امیروں میں
سب ایسے بھاگے کہ اُن کا کہیں نشاں نہ ملا — سرِ زمیں نہ ملا زیرِ آسماں نہ ملا
بہت سے لوگ مقامِ حساب میں آ گئے — بہت سے عرکِ ادب کے عتاب میں آ گئے
چٹخنے تب یہ ادب کے جو تازیانے لگے — تو مارے ڈر کے جگر سب کے تھرتھرانے لگے
ہزاروں قمچیوں سے پٹ کے فرشِ خاک ہوئے — ہزاروں خنجرِ تعزیر سے ہلاک ہوئے
بہت سے اپنے کئے کی سزاؤں میں آ گئے — بہت سے کئے نہ کئے کی بلاؤں میں آ گئے
پر اُس کے ڈر سے کوئی دم بھی مار سکتا نہ تھا — جو روتی آنکھ تو نالہ پکار سکتا نہ تھا

---

ا؎ اگرچہ جو تھا جہاں میں غضب کا مارا تھا — اور اُس پہ قہر جو تھا سب پہ آشکارا تھا
پہ شکوہ کر نہیں سکتے تھے یہ نہار اُس کا — نہ حال لکھتے تھے اخبارِ روزگار اُس کا

---

مگر وہ شاہ کہ تھا جس پہ کُل کا حال کھلا — اور اُنکے حال میں اک کا تھا تا آل کھلا
نہ اپنے بندوں کا یہ حالِ زار دیکھ سکا — نہ درد و غم سے اُنہیں دلفگار دیکھ سکا
کیا اشارہ یہ تہذیب کو کہ جاؤ ابھی — اور اعتدال پہ اُنکے دلوں کو لاؤ ابھی

---

اُدھر سے جب یہ عنایاتِ خسروانہ ہوئی — تو بزمِ قدس سے تہذیب اُدھر روانہ ہوئی
وہ سوئے اہلِ زمیں ایسی شان سے اُتری — کہ جیسے رحمتِ حق آسماں سے اُتری

نہ اُس کے تاج دُرفشاں ہوا تھا سر پر — نہ کوئی چتر جواہر نگار تھا سر پر
مگر عمامۂ خاص اُس کو مشتری نے دیا — اور اپنا چتر تھا طالع کی یاوری نے دیا
تھے وہ جو علم نے خلعت اُسے پنہائے ہوئے — اور اُس کے قامتِ موزوں پہ ٹھیک آئے ہوئے
اثر عدو کے خدنگِ کلام کرتے نہ تھے — اور اعتراضوں کے تیر اپنا کام کرتے نہ تھے
کلام ہاتھ میں تھا آگے تیغ تیز لیئے — تھے جوہر اُس میں سخنہائے شعلہ ریز لیئے
بنائی آتی تھی تدبیر سارے کام اُسکے — خرد بھی کر رہی پردہ میں انتظام اُس کے
تھی صنعت اپنی گُلِ تر بکھیرتی آتی — اور اُن کا رنگ زمانہ پہ پھیرتی آتی
اُسی کے رنگ میں دولت تھی جگمگاتی ہوئی — کہ دونوں ہاتھوں سے تھی سیم و زر لٹاتی ہوئی

---

فلک سے جبکہ زمیں پر وہ نیک نام آئی — لیئے جہان میں آرامِ خاص و عام آئی
وہیں محاسنِ اخلاق بڑھ کے ساتھ ہوئے — جُھکا کے غیظ و غضب سر کو ساتھ ساتھ ہوئے
وہ آپ ٹیکتی آتی تھی تمکنت کی چھڑی — کہ تمکنت کی چھڑی تھی وہ سلطنت کی چھڑی
نہ بات ہر کس و ناکس سے تھی ذرا کرتی — وزیرِ عقل سے تھی گر تھی مشورہ کرتی
جو حکم کچھ سرِ دربار بر ملا ہوتے — تو اُس کی کم سخنی میں سخن ادا ہوتے
تھی دُور بیں کی جگہہ ہاتھ میں لیئے اخبار — جہاں کی سیر بھی اُس کو دکھا رہے اخبار
خلافِ وضع نہ تھی بات مطلقاً کرتی — ہنسی کے حق کو تبسم میں تھی ادا کرتی

---

غرض کہ پہلے ہی جو اُس نے جشنِ عام کیا — تو نظمِ خلق کا پہلا یہ انتظام کیا
کہ مدرسے ہیں جو عالم میں جا بجا جاری — یہ حکم اُن میں بتاکید ہو نیا جاری
کہ لڑکے یاں کے جو محنت زیاد کرتے ہیں — زباں سے لفظ و معانی کو یاد کرتے ہیں
مگر دلوں پہ اثر اُن کے زینہار نہیں — اور اپنے رکھتے یقیں اہلِ روزگار نہیں

اگر دلوں پہ اثر ہو تو کیوں عمل نہ کریں
بدی کو اپنی وہ نیکی سے کیوں بدل نہ کریں
یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں
اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں
کہ الفاظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے
یہ اُن کو مُنہ سے ہیں بک بک کے نیم جاں ہوتے
اب اُنکے ساتھ مطالب کے بھی اثر ہوویں
دلوں میں اُنکے یقیں کرتے کرتے گھر ہوویں

---

یہ حکم جب ہوا دربار شاہ سے جاری
ہوا نہ تھا ابھی دفتر کی راہ سے جاری
ادھر اُدھر کو جو گھاتوں میں بیٹھے لگے اخبار
وہاں زباں بزباں اسکو لے اُڑے اخبار
ہوا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری
کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جابجا جاری
نہ ان کی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں
وہ سب رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں
کہ ان کا فیض مقاصد ہو عام عالم میں
رہیں علوم کے چرچے تمام عالم میں
ولیکن اُن کو بھی تاکید یہ زیادہ ہو
کہ فائدہ کی جو کچھ بات دل نہادہ ہو
باتفاق اُسے مل جل کے رُو براہ کرو
اور اختلاف سے کاموں کو مت تباہ کرو

# مثنوی شرافتِ حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا
نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانماں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشاں سے غرض
تمہارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں
گھرانے اچھے گھر اچھے۔ تمام اچھے ہیں

---

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں
امیر ہو کہ فقیر۔ اس سے کچھ سوال نہیں

کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے — بزرگ صاحبِ زر تھے تو لیکے زر بیٹھے
یہاں تو مایۂ ہمت میں جو زیادہ ہے — بزرگ امیر تھے اور خود امیر زادہ ہے

---

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی — کہیں سے پارِ توطن اُٹھا کے لائے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آبِ صاف چلتا ہے — تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جسکے پھول ہو تم — کمال اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

---

عدم سے آن کے کس خاک پر گرے پہلے — وہ کیا زمین تھی جس پر قدم پھرے پہلے
گزارا تم نے لڑکپن ہے قصرِ شاہی میں — کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مجھے نہ فخر ہے اُس کا نہ عار ہے اُس کی — مگر تلاش ہے تو بار بار ہے اُس کی
کہ رکھتے ملکِ مروت میں رسم و راہ ہو کیا — دکھاتے ہمتِ عالی میں دستگاہ ہو کیا

---

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا — گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایہ
نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں — سبک سبک ہیں و یا ہیں گرانبہا چیزیں
میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلا دو مجھے — خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے
متاعِ حسنِ دیانت دکاں میں ہے کہ نہیں — وفا کی جنس بھی اِس کارواں میں ہے کہ نہیں

---

یہ مانا میں نے کہ باعقل و ذی شعور ہو تم — مقامِ تجربہ کاری میں پہنچے دور ہو تم
نہ کچھ مقدمہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں — نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں
پر اُس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم — کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم
زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے — ثواب ہائے خدا کو عذاب کرتی ہے

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں — جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں
کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ برزبان تو کیا — اور اُن میں پاس ہوئے دیکے امتحاں کہ نہیں
تمہارے خلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں — زباں سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں
فقط جو عالمِ ذی شان ہوگئے تو کیا — مرے حسابوں وہ شیطان ہوگئے تو کیا

جو کچھ کہ مُنہ سے کہو اُس کا لو اثر دل میں — کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کرے وہ گھر دل میں
زبان و دل میں بہم جب کہ ایک ہو جاتے — تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے
دگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں — ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پوچھو تو ہے پھر بھی ناتمام وہ علم — تمام جب ہو کہ پہنچائے فیض عام وہ علم
وہ علم جس سے کہ اوروں کو فائدہ نہ ہوا — ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم کہ کچھ بھی نہ ہو — مگر یہی ہے تمنا کہ ایسے ہو کے رہو
میانِ جلسہ جو آزاد پوچھے آکے کبھی — کہو کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی
کہ باصفاؤ سبک روح و پاک جاں ہم ہیں — تو تم جواب میں جھٹ بول اُٹھو کہ ہاں ہم ہیں

# معرفتِ الٰہی

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش — فصلِ گُل آئی ہے بجوش و خروش

کیا پڑے کنجِ غم میں ہو بیکار    گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار
لطفِ صحبت بہم غنیمت ہے    میاں آزاد دم غنیمت ہے
چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر    گل و گلزار و یاسمن کی سیر
گرچہ بہرِ عوام کالانعام    لطفِ گلگشت ہو گیا بدنام
پر کرو دل میں تم جو اپنے غور    ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور
نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط    قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط
سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں    کہ بری خلق کے گماں میں ہیں
صرف ہووے گر اسمیں حسنِ خیال    تو ہو پھر نقص اس کا عین کمال
گل و سنبل سے تا بخس و خاشاک    خاک سے تا بہ گلشنِ افلاک
رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی    نہیں عبرت سے کوئی شئے خالی
ہر ورق ہے شجر پہ بہرِ حساب    بلکہ دستِ موعظت کی کتاب
گوشِ عبرت نہیں تو کھولتا ہے    ورنہ ہر برگ کا یاں کا بولتا ہے
ہر زباں برگِ گوشِ دل گل ہے    تو ہی مدہوشِ نشۂ گل ہے
ایک دن دل جو میرا گھبرایا    کلبۂ غم سے میں نکل آیا
دل تھا پژمردہ غنچہ وار مرا    ہوا گلزار میں گزار مرا
پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا    پا کے اک جا درخت کا سایا
بیٹھا میں بر کنارِ آبِ رواں    کہ ہے عمرِ رواں حبابِ رواں
کی جو یک بار آنکھ اٹھا کے نظر    برگ اک ٹوٹ کر ز شاخِ شجر
آ پڑا وہ پر سے جوں پیامِ سروش    اور ہوا میری زینتِ آغوش
گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال    پر وہ کہتا تھا فی لسان الحال
کہ اگر تجھ کو چشمِ بینا ہے    تو یہ قدرت کی لوحِ مینا ہے

نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ  دیکھ ان کو بہ چشم اندیشہ
صانعِ غیب کا ہے کار بدیع  کلکِ صنعت کا ہے نگار بدیع
روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا  تھا رگِ شاخ میں مقام مرا
فیض آب اور باد کی نرمی  اُس کی نرمی و مہر کی گرمی
مادرِ خاک سے ہوئے دوچار  رُوح جنبش میں آگئی یکبار
مُنہ کو گردِ عدم سے صاف کیا  سینۂ شاخ کو شگاف کیا
سبز کوپل تھا جب نکالا سر  پر وہ کوپل تھی غیرتِ گلِ تر
کھائی میں نے جو اُس چمن کی ہوا  دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا
میرا یُمنِ قدم یہ آیا راس  ہوگیا ہر درخت خضر لباس
زاد و برگِ شجر ہوا مجھ سے  گُل کا آباد گھر ہوا مجھ سے
بار مجھ میں نہ زینہار آتا  پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا
تاج سر میں سپیدُ نہال ہوا  مجھ سے سارا چمن نہال ہوا
خسروِ گُل کا جب قشون آتا  میرا پرچم تھا پہلے لہراتا
سب کے سر پر تھا نخل کا سایا  میرا سایا تھا نخل پر چھایا
جس سے سارے جہاں کو راحت تھی  ہر مسافر کو استراحت تھی
شاخِ گُل تھی ہری بھری مجھ سے  زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے
تھے رفاقت سے میری سرو آزاد  مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد
چشمِ نرگس چمن کا جوبن تھی  برگ گویا زبانِ سوسن تھی
ساری ذات و صفات ہیں مجھ میں  گُل میں جو کچھ ہے بات ہے مجھ میں
کونسی بات مجھ سے چھوٹی ہے  مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے
مرہمِ زخمِ جان و خاطرِ ریش  برگِ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے
ہست کو نیستی ملازم ہے

# اولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو
چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو
ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موجزن اس دشت میں نہ دوڑ سکو بنکے گر ہرن
کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو
آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگ و نام نے باندھی کمر ہے کس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے دیوارِ باغ وہ نظر آتی ہے سامنے
سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو
یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم کرتے ہو کیا امید یہیں ویسا ر تم
میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم بڑھ جاؤ گے کروگے اگر مار مار تم
چلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو
ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اٹھائینگے دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائینگے نیکی کے زور اٹھ کے بدی کو دبائیں گے
بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو
آئینہ دل کا گردِ سفر سے اجال دو پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو

شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو ہو خوف کا خیال تو بُزدل پہ ٹال دو
اور آپ بن کے شیرِ نیستاں چلے چلو
آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب قرار ہے کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لیا میداں چلے چلو
رکھو رفاہِ قوم پہ اپنا مدار تم اور ہو کبھی صلہ کے نہ امیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم دوزخ کو آپ فخر سے رنگ بہار تم
گلشن میں ہو کے بادِ بہاراں چلے چلو
یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے آبِ رواں ہیں چشموں سے یہ کہ نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے جو تم رہے وہاں وہی خر در وحل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو
آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے چمکا یا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتابِ درخشاں چلے چلو
نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے اب خاتموں پہ آگئے ہیں اُن کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے وہ گونجا طبل فتح کہ میدان لے لئے
ہے کرنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

# سلام علیک

خدا کی نظر آرہی شان ہے سُہانا سا اک سبز میدان ہے

ہوا سے جو سبزہ ہے لہرا رہا
تو ہے دیکھنے سے مزا آ رہا

ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی
ہوا لوٹ کر پھر کھا تی ہوئی

کوئی دل جو مٹی میں ہے مل گیا
تو اک آدھ گل ہے کہیں کھل گیا

وہیں ایک پہاڑ میں تالاب ہے
کہ دن دھوپ اور رات مہتاب ہے

یہ سبزی اسی کے سہارے پہ ہے
درختوں کا جھرمٹ کنارے پہ ہے

لب آب جو ہیں شجر جھومتے
وہ ہیں جھک کے پانی کا منہ چومتے

سماں آج کل ہے گا برسات کا
مزا دن کا ہے لطف ہے رات کا

درخت اک جگہ ہیں جو چھائے ہوئے
ہوا دار بنگلے بنائے ہوئے

تو اک چھوٹے لڑکے نے واں آن کر
جگہ خوب موقعے کی پہچان کر

رکھا سامنے اپنا جزدان ہے
ورق پر لگائے ہوئے دھیان ہے

بہت لکھنے پڑھنے کا ہے ذوق اسے
یہی ذوق ہے اور یہی شوق اسے

ڈھلا ہیگا دن بج چکے چار ہیں
گئے سیر کو اس کے سب یار ہیں

ولیکن دم صبح یا شام ہے
شب و روز اسے کام سے کام ہے

اسی شغل میں اب بھی مشغول ہے
بنا بیٹھا اک مرد معقول ہے

خدا جانے ہے ہاتھ میں کیا کتاب
کہ اس میں ہے ڈوبا چو ماہی در آب

اور آتی ہے جوں جوں سیاہی پہ شام
وہ شوقین لڑکا بذوقِ تمام

جھکا جاتا ہے اس طرح غور سے
کہ کاغذ میں کیڑا ہو جس طور سے

نظر اسکی جب تھرمرانے لگی
سیہ شام سرمہ اڑانے لگی

بہت بیٹھے بیٹھے جو تھا تھک گیا
اک انگڑائی لے کر وہ لڑکا اٹھا

ملا کر بہم چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ
ملے چہرے پر لطف محنت کے ساتھ

تھا فارغ جو ہو کر اٹھا کام سے
تو پھولا برنگِ شفق شام سے

لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش کلام
مبارک مبارک خوشا وقتِ شام

رکھا پھر کتابوں کو جزدان میں ٹہلنے لگا آ کے میدان میں
لگی ٹھنڈی ٹھنڈی جو منہ پر ہوا حواس اُس کے آئے ٹھکانے ذرا
تھے دن کے تھکے ماندے جو جانور وہ اپنے مقاموں میں سب آن کر
بہم مل کے آوازیں دینے لگے بسیرے درختوں پہ لینے لگے
وہ مل جل کے آپس میں تھے بولتے کہ اپنی خوش آوازیاں تولتے
درختوں پہ چڑیوں کی چوں چوں کہو جو سمجھو تو پھر یاد ہے چوں کہو
جو سبزے میں جھینگر تھے برسات کے وہ لے چھیڑ اُنھوں نے بھی سُر رات کے
کئی غول طوطوں کے چمکارتے گئے سبز سبزہ سے بل مارتے
تھا لڑکا بھی حیران یہ کیا ہو گیا کہ بس اُن کا سبزہ ہوا ہو گیا
کلولوں میں سناٹے بھرتے ہوئے وہ تھے اس طرح باتیں کرتے ہوئے

کہ خوش ہو کے بولا وہ رنگیں کلام
مبارک مبارک خوشا وقتِ شام

کیا خاتمہ دن کا جب شام نے تو لی گھر کی راہ اُس خوش انجام نے
اِدھر اور اُدھر کو نظر ڈالتا چلا جاتا تھا دیکھتا بھالتا
کہ کچھ گائیں بھینسیں ملیں راہ میں پھریں کھیت سے گھر کی تھیں چاہ میں
ٹپکتی خوشی صورتِ حال سے عجب جا رہی تھیں لٹک چال سے
بھرے دودھ سے تھن لٹکتے ہوئے کہ مشکیزے جیسے چھلکتے ہوئے
کئی ساتھ ساتھ اُن کے گوسالے تھے کہ ماؤں نے تھن کے تلے پالے تھے
اور اک گلہ بان پیچھے آتا ہوا تھا الغوزہ اپنا بجاتا ہوا

ملیں راہ میں اسکو کچھ بکریاں
اور اک بوک بکرا رواں درمیاں

کئی بربری ان میں گلزار تھیں
پہاڑی تو دو دوں میں سرشار تھیں

وہ دو دو دل نہالی تھیں پوتوں پھلیں
کہ دن بھر تھیں چر چگ کے گھر کو چلیں

پھلواسے بچے اچھلتے ہوئے
کئے اٹکھیلیوں سے مچلتے ہوئے

محبت سے چمپاتا جاتا کوئی
بہت تھک کے ماں کو بلاتا کوئی

انہیں دیکھ کر گھر کے شوقوں میں شاد
لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش نہاد

بھرو شیر مادر سے الفت کے جام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

وہ لڑکا جو پہنچا بہ نزدیک شہر
نظر آئی یاں ادہی لہر بہر

دو کانوں پہ روشن سراسر چراغ
چراغوں سے گویا لگائے تھے باغ

جو رونق کہ نیچے دوکانوں پہ ہے
کچھ اس سے سوا بالاخانوں پہ ہے

دکھاتے جو ہیں روشنی دور سے
اڑی جاتی ہیں کھڑکیاں نور سے

تصاویر و نقشوں سے گلزار گھر
طرحدار کمرے ہوادار گھر

کہیں مل کے بیٹھے ہیں کوٹھے پہ یار
کہے شعر خوانی ہے گاہے ستار

غزل ریختے کی ہے گاتا کوئی
ہے گاتا کوئی اور بجاتا کوئی

لطیفوں پہ اڑتے ہیں جو قہقہے
کہاں بادِ بلبل کو یہ چہچہے

غرض ہر جگہ سے گزرتا ہوا
تماشے خدائی کے کرتا ہوا

گیا جب کہ گھر میں وہ روشن چراغ
تو ماں باپ بھی ہو گئے باغ باغ

خوشی سے نہ جامے میں پھولوں سمائے
بہن بھائی بولے وہ آئے وہ آئے

سلام اس نے پہلے کیا باپ کو
جھکایا بہ حسنِ ادب آپ کو

دعا دی یہ اس نے بھی لیکر سلام

## مبارک مبارک خوشا وقت شام

بچھا صحن میں تھا بڑا سا جو تخت / وہاں آکے بیٹھے وہ فرخندہ بخت

لگا سامنے آکے دستار خواں / بہم کھا کھلا کر ہوئے شادماں

فراغت ہوئی کھانے پینے سے جب / بچھونوں پہ آئے قرینے سے سب

برابر برابر بچھے تھے پلنگ / پڑیں چادریں ان پہ مہتاب رنگ

فلک نیلگوں رنگ نکھرے ہوئے / ستارے تمام اُن پہ بکھرے ہوئے

چمک کر چڑھا چرخ پر چاند تھا / کہ سورج کا مُنہ کر دیا ماند تھا

ادھر چاندنی نور پھیلا رہی / سیاہی اُدھر رنگ دکھلا رہی

وہ چھائی ہوئی رات تاروں بھری / کہ چادر ہو جیسے ستاروں بھری

پلنگڑی پہ لڑکا تھا لیٹا ہوا / کہ بیٹا تھا شکر لپیٹا ہوا

پدر تھا جو تاریخ کا رازداں / سناتا تھا ہر دم نئی داستاں

کبھی کرتا خود شعر خوانی تھا وہ / کبھی سنتا ماں سے کہانی تھا وہ

دیا یہ مزہ اُن حکایات نے / کہ انگڑائی گردوں پہ لی رات نے

ہوا آکے پنکھا ہلانے لگی / ہر اک کو غرض نیند آنے لگی

تھکے ماندے دن بھر کے تھے ہو رہے / وہ چپٹے لئے تان اور سو رہے

بیاں کیا کروں رات کی شان کا / زمانہ میں عالم وہ سنسان کا

پڑا نیند میں مست سارا جہاں / نہ تھے چور باقی نہ تھے پاسباں

پڑے سوتے سب ایسے مدہوش تھے / کہ گھڑیال تک بھی تو خاموش تھے

درختوں میں تھیں جو گذرتی ہوائیں / زمانہ پڑا کرتا تھا سائیں سائیں

شب تار بھی نیند میں آن کر / سیہ چادر اپنی پڑی تان کر

ہمیشہ زمانے کا دستور ہے / اندھیرے سے کرتا عیاں نور ہے

کہ چمکا ستارہ سحرگاہ کا — ہوا رنگ پھیکا رُخِ ماہ کا
ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں — تعجب سے مشرق کو تکنے لگیں
شبِ تار کا رنگ فق ہو گیا — چراغِ سحر جاں بحق ہو گیا
ہوئی یک بیک روشنی سی نمود — اُبلنے لگا دیگِ مشرق سے دود
سحر کے جو عالم نمودار تھے — دھوئیں اُڑ رہے تھے شبِ تار کے
لگے بولنے سب سحر کے طیور — گئی اُن کی آواز نزدیک و دور
وہ لڑکا جو تھا بسترِ خواب میں — ستارہ ہو جوں چادرِ آب میں

اُٹھا کر کہا اُس نے تکیہ سے سر
سَلامٌ عَلَیکُم مبارک سحر

# جیسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقعِ عبرت بنا دکھاتا ہے — اور ایسے شخص کا ایک ماجرا سُناتا ہے
کہ سب تمہارا سا تھا کارخانہ اُسکے لئے — یہی زمیں تھی یہی تھا زمانہ اُس کے لئے
فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا — جو پوچھو کون؟ تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا
مٹایا گردشِ گردوں نے آہ نام اُسکا — نہ آج نام ہے اُسکا۔ نہ کچھ مقام اُس کا

---

پر اتنا سچ ہے کہ غمگین و شاد ہونے سے — خوشی کے ہنسنے سے اور دردِ غم کے رونے سے
کبھی امید سے اور گاہ ناامیدی سے — کبھی خطر کی خبر گاہ خوش نویدی سے
جو ایک رنگ تھا آتا تو ایک جاتا تھا — خیال اُس کا مرقع نیا بناتا تھا
یہ دل جو سینہ میں جنبش ہے دمبدم کرتا — کہ ہے اسی پہ ہر اک زندگی کا دم بھرتا

دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے ۔۔۔ کوئی یقیں ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے
ہمائے ہمت عالی کا اوج پر جانا ۔۔۔ کبھی یہ جبر کبھی خود بخود اُتر آنا
غرض اُٹھاتا یہ کیفیتیں ضرور تھا وہ ۔۔۔ کہ آخرش یہی انسان باشعور تھا وہ

---

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا ۔۔۔ جہاں کے شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا
جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہ چکا ہے وہ ۔۔۔ جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ
مگر میں کیا کہوں مجھ کو تو اب یہ رونا ہے ۔۔۔ کہ جو وہ آج ہے اک دن وہ تم کو ہونا ہے

---

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں ۔۔۔ یہ سال و ماہ جو موسم کے انقلاب میں ہیں
بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں ۔۔۔ بہار میں سر سبزہ کو تاج دیتے ہیں
یہ فرش خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پر ۔۔۔ یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر
جب اُسکے طوق گلو زندگی کا قصہ تھا ۔۔۔ تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصّہ تھا
یہ سب کچھ اب بھی ہے پر اسکی کچھ خبر بھی نہیں ۔۔۔ جو ہو تو نفع نہیں گر نہو ضرر بھی نہیں
بلا سے اُس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے ۔۔۔ وہ یا کہ ملک فنا گلشن بقا ہو جائے
وہ آپ ہی جب نہ ہوا پھر جہاں ہوا نہ ہوا ۔۔۔ زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہوا نہ ہوا

---

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں ۔۔۔ یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں
یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے ۔۔۔ ستارے جن سے زمیں آسمان روشن ہے
کسی میں دور کا اُسکے نشاں نہیں باقی ۔۔۔ پتا تلک بھی تہِ آسماں نہیں باقی
قضا نے لیکے الٰہی کہاں چھپایا اُسے ۔۔۔ زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اُسے

کسی کے حسن پریوش کا وہ دیوانہ تھا　　اور اُس کے تیر ادا کا ہوا نشانہ تھا
پر اب جو دیکھو تو وہ غیرت پری بھی نہیں　　وہ اُس کے نازوہ اندازو لبری بھی نہیں
فنا کے بزم میں ساقی نے اُس کو جام دیا　　مرض کا نام کیا موت کا پیام دیا
طبیب آئے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی　　خود آیا حسن سفارش کو پر ذرا نہ چلی
فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے　　دہانِ گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

---

ازل کی صبح کہ جس میں جہاں ہوا پیدا　　اور اُس کے ساتھ ہی گویا ہوئی فنا پیدا
کتابِ عمرِ جہاں آج تک پڑھی میں نے　　ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی میں نے
ہر اک کا راز ہے اس میں کہیں کہیں کھلتا　　پر اُس غریب کا احوال کچھ نہیں کھلتا

بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچھ بتا تو سہی
ہے وہ بھی اتنا ہی کہتا کہ کوئی تھا تو سہی

# جغرافیۂ طبعی کی پہیلی

## جو منشی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر زبانہائے مشرقی کی فرمائش سے نظم کیگئی

ہنگامۂ ہستی کو　　گر غور سے دیکھو تم
ہر خشک و ترِ عالم　　صنعت کے تلاطم میں
جو خاک کا ذرّہ ہے　　یا پانی کا قطرہ ہے

حکمت کا مرقع ہے جس پر قلم قدرت
انداز سے ہے جاری اور کرتا ہے گلکاری
اک رنگ کہ آتا ہے سو رنگ دکھاتا ہے

---

اور دیکھنے والوں کی آنکھیں تو کھلی ہیں پر
خرمہرۂ رنگیں - یا بلور کے ٹکڑے ہیں
ہر لحظہ و ہر ساعت قدرت کے تماشے ہیں
عالم میں پڑے ہوتے پر ان کو نہیں پروا
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے اور ہے تو سبب کیا ہے؟

---

ایسے بھی مگر اکثر ارباب بصیرت ہیں
جو کھولے ہوئے ہر دم ہیں دیدۂ عبرت کو
ذرہ ہو کہ ہو سورج معنی ہو کہ ہو صورت
ہر جلوۂ قدرت میں سرمہ انہیں حکمت کا
سرمایۂ بینائی اور عینک عبرت ہے
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی جس سے کہ زمانہ کی
گرمی ہو وہ یا سردی یا ہووے تری خشکی
حکمت کا معما ہے قدرت کی پہیلی ہے
نقطہ ہے اگر اس میں ہے عقدۂ سربستہ
عقدہ ہے اگر اس میں ہے نکتۂ برجستہ

اک سیدھی سی بات اس وقت ‏ آئی ہے تصور میں
وہ یہ ہے کہ دو چیزیں ‏ کیا ایسی ہیں دنیا میں
آپس میں جو رکھتی ہیں ‏ پیوند زنا شوئی
اولاد سے جن کی سب ‏ آباد زمانہ ہے
نقلی نہیں افسانہ ‏ سب نے اُسے مانا ہے
اور پھر انہیں دونوں کو ‏ دیکھو جو نظر بھر کر
ماں بیٹی کا ہے ناتا ‏ دونوں میں نظر آتا
شور رشتہ کہ عالم میں ‏ پیدایشیں لاکھوں ہیں
اصلوں کی بہت نسلیں ‏ رشتوں کے سر رشتے ہیں
اس پیچ کا پر رشتہ ‏ دیکھا نہ سُنا کوئی

---

آزاد بھلا ہے کون ‏ جو آگے ترے بولے
یا بند گرہ کھولے ‏ ہاں یہ کہ مگر تو ہی
کہہ سُن کے سوال اپنا ‏ دے آپ جواب اپنا

---

وہ دو کہ بہم جن میں ‏ ہے عقد زن و شوہر
عالم میں ہیں دو جو ہر ‏ خشکی و تری جن سے
صنعت کہ قدرت میں ‏ پیدا و ہویدا ہیں
سب عالم جسمانی ‏ حیوانی و انسانی

---

اور دو کے رشتے سے ‏ گر غور کرو دل میں

تو دیکھ لو پانی کو ‏ جس رنگ میں جی چاہے
بادل ہو کہ ہو باراں ‏ قطرہ ہو ویا دریا
شبنم سے بھی کم ہووے ‏ یا نام کو نم ہووے
اک عرصۂ خاص اس پہ ‏ گزرے گا تو دیکھو گے
خشکی کے نشاں ہوتے ‏ اس میں سے ہویدا ہیں
یا بچے ہیں جو ماں کے ‏ آغوش میں پیدا ہیں

---

کیوں قبلۂ من دیکھا ‏ یہ طرفہ معما ہے
کیا بوجھے کوئی پنڈت ‏ یا فلسفئ و ملا
ہاں سمجھیں میاں آزاد ‏ یا منشی ذکاء اللہ
سنبل ہے یہ سبزہ میں ‏ پھولوں میں چنبیلی ہے
کون اس کو بھلا بوجھے
حکمت کی پہیلی ہے

# مبارک باد جشن جوبلی

اے خوشی آ۔ ترے آنے سے زمانہ روشن ‏ آ۔ کہ تو آپ ہے روشن ترا آنا روشن
اے خوشی آ۔ ترے آنے سے ہے گھر گھر شادی ‏ ہے ترے آنے سے ہر لب پہ مبارکبادی
یاد میں بیٹھے تھے یارانِ دل آگاہ تری ‏ سالہا سال سے تھے دیکھ رہے راہ تری

---

ہم خوشی اس کو نہیں کہتے جو ہر سال آئے ‏ خلعتِ عید میں ہنستی ہوئی خوشحال آئے

اس برس پرورشِ عام جو مبندول ہوئی  واسطے اُن کے بھی تدبیر ہے مقبول ہوئی

ہوئی مقبول زمانہ میں جو یہ خوشخبری  گھر بہ گھر دل کی امید دل سنے ہے کی جلوہ گری
کہیں ساماں ہے کہیں یہ سر و ساماں خوش ہیں  یہ خوشی وہ ہے کہ ہندو و مسلماں خوش ہیں

رات درگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں  دن کو پھرتے ہیں تو شکرانے ادا کرتے ہیں
ان میں ہے بندۂ آزاد یہ کہتا بہ نیاز  حضرتِ قیصرۃ الہند کی ہو عمر دراز
اُن کے فرزند سدا خرّم و دلشاد رہیں  اُن کی اولاد سے آبادیاں آباد رہیں

جاری اس جشن مبارک کا سدا دَور رہے
روشِ گردشِ دولاب یہی طور رہے

# ایک تارے کا عاشق

اک سحخور کسی تارے کا تماشائی تھا  اُسکے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
دل سے وہ چاند کا ٹکڑا اُسے بھایا ہوا تھا  اور وہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہوا تھا
وہ ستارا کہ ہوا آنکھوں کا تارا تھا اُسے  چشمِ حیرت میں نظارے کا سہارا تھا اُسے
اوجِ معنی سے فضا میں تھا اُتارا کرتا  اور اُنہیں اپنے ستارے پہ تھا وارا کرتا
چشمِ حیرت سے نظر اُس پہ سدا کرتا تھا  دل کے سب راز و نیاز اُس سے ادا کرتا تھا
غم جو اک شب اُسے بے تاب و تواں کرنے لگا  مُنہ ہی مُنہ میں یہ سخن اُس سے بیاں کرنے لگا
ہے تو تو رشکِ پری غیرتِ صد حور ہے تو  مگر اس عاشقِ دلدادہ سے کیوں دور ہے تو

منہ ترا مہر صفت سے گا دمکتا پیارے — سرد مہری سے مگر کیوں ہے جھجکتا پیارے

اے وہ تو جس پہ کہ قابو کی کوئی بات نہیں — چشمِ حسرت کے سوا حرف و حکایات نہیں

ہیں جو ارمان بھرے دل میں نکالوں کیونکر قطعہ ہائے چھاتی سے تجھے اپنے لگاؤں کیونکر

دم نکل جائے تو ہو یار مبارک مرنا — یوں ہو مرنا تو ہو سو بار مبارک مرنا

اپنے تارے کو جو حسرت سے یہ تکتا تھا پڑا — جامِ دل جوشِ محبت سے چھلکتا تھا پڑا

آدمیت اُسے تب اُس کے خیالات نے دی — دفعتاً جنبش ادھر شوقِ ملاقات نے دی

بن کے عورت کششِ عشق کی ماری آئی — آسماں چھوڑ زمیں پر وہ بچاری آئی

یہ تو بتلا کسی عورت کی ہے چھاتی اچھی — یا کرن تارے کی شب کو نظر آتی اچھی

سُنی شاعر نے جو یہ بات تو شرمایا بہت — بلکہ شرمایا نہیں جتنا کہ پچھتایا بہت

بولا افسوس وہ تارا جو اُڑا آتا تھا مجھے — اوجِ افلاک پہ کھینچے لئے جاتا تھا مجھے

آج وہ نورِ فلک ہاتھ سے کھویا میں نے — بولی وہ اپنا بھی کام آج ڈبویا میں نے

تو نے گردوں پہ چمکتا ہوا تارا کھویا
میں نے ہاں عاشقِ شیدا سخن آرا کھویا

## محنت کرو

ہے امتحاں سر پہ کھڑا محنت کرو محنت کرو — باندھو کمر بیٹھے ہو کیا محنت کرو محنت کرو

بیشک پڑھائی ہے سوا اور وقت ہے تھوڑا رہا — ہے ایسی مشکل بات کیا محنت کرو محنت کرو

شکوے شکایت جو کہ تھے تم نے کہے ہم نے سنے — جو کچھ ہوا اچھا ہوا محنت کرو محنت کرو

محنت کرو انعام لو انعام پر اکرام لو — جو چاہو گے مل جائیگا محنت کرو محنت کرو

جو بیٹھ جائیں ہار کر کہدو انہیں للکار کر — ہمت کا کوڑا مار کر محنت کرو محنت کرو

---

گر ہوئی پیدا اس سے کرا اے شاعرِ شیدا میرے — شوقِ دیدار تھے دل میں ترے کیا کیا میرے
کششِ شوق نے تیری مجھے بلوا ہی لیا — تو وہ عاشق ہے کہ آخر کو مجھے

تدبیریں ساری کہہ چکے۔ باتوں کے دریا بہہ چکے
بک بک سے اب کیا فائدہ محنت کرو محنت کرو

ہمت نہ گر ڈالو گے تم۔ دل سے نہ اُسے پالو گے تم
دیکھو گے پھر اسکا مزا۔ محنت کرو محنت کرو

محنت جو کی جی توڑ کر۔ پھر شوق سے منہ موڑ کر
کر دو گے دم میں فیصلہ۔ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہو یا سوداگری۔ ہو پیشہ یا ہو چاکری
سب کا سبق یکساں تنا محنت کرو محنت کرو

جب دن بڑے تم ہو گئے دنیا کے دھندے میں پھنسے
پڑھنے کی پھر فرصت کبھی محنت کرو محنت کرو

بچپن رہا کس کا سدا انجام کو سوچو ذرا
پھر تم کہو گے ہاتھ سے گیا۔ محنت کرو محنت کرو

# نو طرزِ مرصّع

اقبال اک برس جو مرا ناج سر ہوا
شملہ پہ مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو جمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

وابار پر کہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دیکھا لحافِ ابر میں منہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سپید
باہر چلو تو دامنِ کہسار تھے سفید

پتے بھی اُسکے جاڑے نے سب دور کر دئے
اور کچھ درخت برف نے بلور کر دئے

اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا

دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں
ہمت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے ہے نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!

ہمت کا اُسکی حال میں لکھکر سناؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا

پیارا تھا نوجوان عجب آن بان سے
پیدا اُسکی وہ شان تھی اُس کے نشان سے

چلتا قدم اُٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا

کیا جانے فکرمند تھا یا کیا ملال تھا — تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا — لیکن خموشی اُس کی یہ آواز کرتا
دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا — دامن تھا اُس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آکے خود سیاہیِ شب راہ پر پڑی — آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی — باتیں کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سرِ دیوار سامنے — دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کے ساماں پکارتے — تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا — اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ بچ بچ بچا بچا
سمجھانے والے سب یونہی سمجھا کے رہ گئے — اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے
چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو!

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شبِ تیرہ فام نے — اک پیرِ مردِ تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دبا — موئے سپید نے نمدی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے — اور یہ وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں — چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتیں بلائیں
طوفانِ برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا — ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
مانا کہ لطفِ عیش و طرب پر نظر نہیں — جانا کہاں ہے موت کا بھی تجھ کو ڈر نہیں
یہ سن کے نکلا شعلہ دلِ نوجوان سے — گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اُس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو!

تھی رات رنگ ابھی رخِ عالم پہ پھیرتی — گہ مشک اڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی
کیا جانے ہم نکل کے کدھر سے کدھر گئے — دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اتر گئے

موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے اہک گئی — خوشبو کا ہے یہ حال کہ دنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آوازیں دے رہے — مل جل کے ساتھ جیسے ہوں دمساز رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آرہیں — جو زیر و بم کی دُھن سے ہیں سُر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پری زاد سامنے — کی رمزِ گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے — آرام کیجے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے مگر چشمِ ناز سے — اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے

پھر اتنا مُسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو!

تنگ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا — لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
مُنہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا — گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی — چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گُلِ تر کی لالیاں — اور اَوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا — اور جھوم جھوم کر وہ رُخِ گُل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی — شبنم تھی آ کے رات کو موتی لٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو جل کھل کے بہتے تھے — پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے
سُورج نے سر نکالا ایک پہاڑ پر — بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر

آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں بڑھے چلو!

تبدیل جبکہ دھوپ سے رنگِ سحر ہوا — اک مدرسے کے آگے سے اسکا گذر ہوا
تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا — مُلا تھا اُس میں برسرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا — اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حُور و قصور پہ تھا دلوں کو لبھا رہا — دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اُسکی باتوں پہ مدہوش ہو رہے — اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے

دیکھا جو نوجوان کو اس مردِ پیر نے
اپنی لکیر پیٹی پُرانے فقیر نے
یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم
بیٹھو کہ تم کو عرش کے اوپر اُڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ زمانے گزر گئے
وہ رات ہو چکی وہ فسانے گزر گئے
اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو!

ملک فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے
بے پاؤں بے مدار ہے جو اس کی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ
ہمت کے معرکوں کے لئے خوب جا ہے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے
مطلق اِدھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض
ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانہ ہے
افلاس اُن کے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت سے کام ہیں
محنت سے پیٹ پالتے صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے
تنخواہوں پر ہیں منشی استاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام
کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام
آزاد کی یہی ہے صدا ہاں بڑھے چلو!

# نظم اردو

۸ مئی سنہ ۱۸۷۴ء کو نظم اردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں عمدہ یادگار سمجھا جائیگا۔ نظم مذکور کی آگ ایک چقماق سے نکلی تھی جس کا ایک پرزہ شعرائے آتش بیان کی طبع روشن تھی۔ دوسرا پرزہ امرائے زندہ دل کی گرم

طبیعت۔ ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدہ کو ولادت دی۔ اور دوسرے کی قدردانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔ مخلوق مذکور اُسی حال میں بڑھیا ہو کر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی معمولی مضمون تھے جو پہلے استادوں نے نکالے تھے موجودہ شاعر چبائے ہوئے نوالوں کی طرح انہیں لیتے تھے۔ الفاظ اَدل بَدل کرتے تھے۔ اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے سال مذکور میں میرے اُستاد پروفیسر آزاد کو یاد فرمایا۔ اُنہوں نے اس مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا۔ اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ اہل علم۔ اہل ذوق جمع ہوئے۔ نثر اور نظم مذکور پڑھی گئی۔ اور سب نے صلاح کرکے ایک مشاعرہ قائم کیا۔ کہ شعرا ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ ۱۱ مہینے تک مشاعرہ قائم رہا۔ اُس وقت نظم مذکور کی شروع پر لوگوں نے کچھ کچھ مخالفت کی۔ مگر ۱۴ برس کے عرصہ میں اتنا اثر ہوا کہ اب ہندوستان کے مشہور شہروں میں ویسی ہی نظموں کی آوازیں آتی ہیں۔ لکچر اور مثنوی مذکور اب نہیں ملتی۔ اور لوگ طلبگار رہیں۔ چونکہ یہ تاریخی مطلب ہے۔ اس کے حرفوں کو مٹنے دینا نہیں چاہیے۔ اس لئے اس کتاب میں لکچر مذکور کا درج کرنا مصلحت ہے تاکہ نئی نسل کے خیالات میں وسعت پیدا کرے۔ (راقم [illegible] شاگرد حضرت آزاد مرحوم)

---

(صفحہ ۱ کا پیراگراف) جب یہ [illegible] اُردو پیدا ہوئی تو کئی سو برس تک [illegible] باتیں رہیں یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ پریشان شعر تو کئی سو برس سے اُردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہجہان کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی تو ولی شاعر پیدا ہوئے اور ساتھ ہی جابجا دیوان ترتیب ہونے لگے۔